آمادہ ہو گئے۔ قیس بن سعد حاکم بن کر آئے تو اسے مزید استقلال نصیب ہوا۔ اب پرچم تشیع حدودِ مصر پر لہرا رہا تھا اور لشکرِ اسلام ترقی پذیر تھا۔ عمرو عاص کے آنے کے بعد یہ رفتار کچھ سست پڑ گئی لیکن اموی دور کے خاتمہ کے ساتھ ہی دلوں میں چھپے ہوئے جذبات محبت ابھر آئے اور مذہب شیعہ حالات کے پیشِ نظر نمایاں و پنہاں ہر طریقہ سے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ آج بھی شیعوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود ہے۔

پاک و ہند میں تشیع کی اشاعت ان مبلغین کے ذریعے ہوئی جو مختلف مقامات سے آتے رہے اور اسلام کی دعوت میں مصروف رہے۔ انھوں نے ایک بڑی جماعت کو مسلمان بنایا اور پھر وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ چنانچہ آج تک وہاں کے مختلف شہروں میں شیعیت کا وجود نمایاں طور پر نظر آتا ہے بلکہ بعض مقامات کو تو مرکزیت حاصل ہے جیسے لکھنؤ جو اودھ کا دار الحکومت رہ چکا ہے اور جس نے دورِ قدیم اور عصر حاضر میں بے شمار علماء پیدا کئے ہیں وہاں سلطان المدارس، ناظمیہ اور مدرسۃ الواعظین جیسے تعلیمی مرکز ہیں جن سے اربابِ علم و فکر، علوم و معارف حاصل کر کے تشنگانِ خلائق کو سیراب کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے علاوہ بھی جونپور، مظفر آباد، لاہور اور پنجاب جیسے عظیم مرکز موجود ہیں۔ (تاریخ الشیعہ صفحہ ۲۵۸) (یاد رہے کہ مولف محترم نے بلادِ ہند کی شیعیت پر باقاعدہ روشنی نہیں ڈالی اور جو کچھ لکھا ہے وہ قبل تقسیم کا قصہ ہے۔ تقسیم ہند و پاک کے بعد شیعیت کی اس نوعیت میں بڑی حد تک تغیر پیدا ہوا ہے۔ کراچی جس کا کل تک ذکر بھی نہ تھا آج شیعوں کا بہت بڑا مرکز شمار کیا جاتا ہے۔ اور خود ہندوستان میں لکھنؤ میں علوم آلِ محمدؐ کا عظیم ترین ادارہ تنظیم المکاتب قائم ہو چکا ہے جس کی مثال پورے ایشیا میں کہیں نہیں ہے اور الٰہ آباد میں عظیم دینی جامعہ انوار العلوم قائم ہے۔ اور بنارس میں جامعہ جوادیہ وایمانیہ، فیض آباد میں وثیقہ کالج کے علاوہ مختلف شہروں اور صوبوں میں دینی ادارے اور مدارس کام کر رہے ہیں۔ جوادی)

ترکی میں تشیع نے کافی ترقی کر لی تھی لیکن سلطان سلیم نے دسویں صدی کی ابتدا میں ان کی ایک بڑی تعداد کو تہ تیغ کر کے ترقی کے راستوں کو روک دیا ــــــ ابراہیم طبیب کا بیان ہے کہ سلطان سلیم تشیع کے بارے میں بے حد متعصب تھا۔ اس کے دور میں شیعیت کافی پھیل چکی تھی اور اسی لئے اس نے اس سلسلہ کو روکنے کے لئے شیعوں کے قتل عام کا حکم دے دیا اور اس طرح

چالیس ہزار افراد کا خون حلال کر لیا گیا۔ اب شیعوں کا قتل مباح بلکہ قابلِ انعام واکرام عمل تھا۔ (مصباح الساری ونزہتہ القاری ص۱۲۳) لیکن ان سب مظالم کے باوجود آج بھی ترکی میں بکثرت شیعہ موجود ہیں۔

سعودی عرب میں قطیف وغیرہ خالص شیعہ مرکز ہیں۔

احسار میں برابر کی آبادی ہے۔ ان دونوں مقامات سے ہر دور میں علمار پیدا ہوتے رہے ہیں اور نجف اشرف سے طلبِ علم کر کے تبلیغِ مذہب کے اہم فریضہ کو ادا کرتے رہے ہیں۔

قطر وغیرہ میں کافی تعداد میں شیعہ پائے جاتے ہیں۔

افغانستان میں آج بھی تقریباً ایک کروڑ شیعہ ہیں جن میں سے تین ہزار کے قریب نجف اشرف میں مقیم ہیں۔ بعض تحصیلِ علم کی خاطر اور بعض کسبِ معاش کے لئے ـــــ یہاں سے بھی مختلف اربابِ علم ومعرفت اور صاحبانِ فکر ونظر پیدا ہوتے رہے ہیں۔

امریکہ میں شیعوں کی آبادی ۵۰ ہزار کے قریب ہے جن میں ہندوستانی، ایرانی، عراقی سب ہی ہیں لیکن اکثریت جبلِ عامل کے ان حضرات کی ہے جو بغرض تجارت وزراعت وہاں آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مذہبی شعائر کے اعلان میں آزاد ہیں۔ مجالسِ عزا برپا کرتے ہیں اور اب ایک عظیم مسجد بھی تعمیر ہو گئی ہے۔ (دورِ حاضر میں یہ آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور تقریباً ایک سو سے زیادہ مرکز قائم ہو چکے ہیں۔ جوادی)

روس میں ۱۳۳۲ھ کی جنگ سے پہلے بخارہ اور قفقاز وغیرہ کی طرف شیعوں کی کثیر آبادی تھی۔ شعائر مذہب کا اعلان ہوتا تھا۔ لوگ زیارات کے لئے آتے تھے۔ طلابِ علم کی آمد ورفت تھی، لیکن اب یہ تمام باتیں کہاں؟ اب تو مہاجرین اپنا وطن دیکھنے کے لئے ترس رہے ہیں۔ (الحمد للہ روس کی صورتِ حال بھی بدل چکی ہے اور وہاں بھی شیعیت کا چرچا شروع ہو گیا ہے۔ جوادی)

عراق میں تشیع پہلی صدی ہجری ہی سے پھیل چکا تھا۔ مدائن وبصرہ کے ساتھ کوفہ میں شیعوں کی ایک عظیم تعداد تھی۔ جنھوں نے عہدِ معاویہ کی سختیاں برداشت کیں لیکن تشیع کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

مدائن میں حضرت سلمان فارسی اور حذیفہ یمانی مصروفِ تبلیغ و ترویج مذہب تھے اور آج کا عراق تو اپنے تشیع میں عظیم شہرت کا مالک ہے۔ آج شیعوں کی اکثریت ہے۔ عراق کے شیعوں نے ترکوں اور انگریزوں سے مقابلہ کرنے میں جس بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخ میں ایک سرمایۂ افتخار کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایران میں صدر اسلام سے شیعیت کی رفتار انتہائی سست تھی۔ صرف ایک قم شیعہ تھا۔ باقی شہر عباسی یا اموی ذہنیت کے مالک تھے۔ خراسان کا غالی فرقہ معاویہ کی نبوت کا قائل تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ حالت بدلی اور تشیع کی رفتار تیز ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آج ایران دنیا کا سب سے بڑا شیعی مرکز ہے۔ آج وہاں کے علماء و فضلاء مذہب کی خدمت میں اور وہاں کے اہلِ ایمان مذہبی تعمیرات میں نمایاں طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ (الحمدللہ اب تو وہاں علماء اعلام کے زیرِ اثر شیعہ حکومت بھی قائم ہو چکی ہے اور ایک حوزہ قم میں ۳۰-۲۵ ہزار طلاب و افاضل مشغولِ تحصیلِ علم ہیں۔ جوادی)

یمن میں شیعوں کی ایک کثیر تعداد ہے جس کا سلسلہ صدر اسلام سے ملتا ہے۔ (خطط الشام، مع الشیعہ الامامیہ، تاریخ الشیعہ، احسن التقاسیم، مجالس المومنین)

آگے چل کر ہم شیعوں کے مذہبی جذبات اور ان کی اسلامی ثقافت کا تفصیلی تذکرہ کریں گے۔ اور یہ بتائیں گے کہ ان کے دلوں میں مذہبی جذبات کس انداز سے بیدار ہوئے ہیں اور انھوں نے بقائے اسلام کی خاطر کس استقلال و پامردی کا مظاہرہ کیا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ تاریخ نے ان کے جذبات کو واضح طریقہ سے نہیں بیان کیا ہے بلکہ ان کے بارے میں تمام معلومات کو مجمل اور مشتبہ رکھا ہے۔ اس لئے کہ اکثر اربابِ قلم پر خواہشات کا غلبہ اور ان کی تحریروں پر تعصب کا قبضہ تھا۔ انھوں نے ہمیشہ افترا پردازی اور جعلسازی سے کام لیا ہے اور حقیقت کے چہرہ کو داغدار بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے۔

تصفیۂ حساب

تاریخ اسلام کچھ ایسے دردانگیز سانحے بھی بیان کرتی ہے جن کا تعلق مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور بالخصوص شیعہ سنی نزاع سے ہے۔ ہم جب ان نزاعات کے اسباب کی جستجو کرتے ہیں تو ہمیں ان کے پس منظر میں مذہب سے زیادہ سیاست کی دخل اندازی نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر حکومت نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے قوم کے اختلاف کو ضروری سمجھا ہے اور انھیں کسی نہ کسی جھگڑے میں مبتلا رکھنا اپنا فرض اوّلین قرار دیا ہے۔

انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان تنازعات میں کتنی جانیں تلف ہوں گی۔ کتنے گھر برباد ہوں گے اور کتنی تہمتوں کے دروازے کھلیں گے بلکہ ان کا مقصد صرف اپنی خواہش کی تکمیل تھی جو ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔

ہمیں سر دست مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ ان کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی پشت پر بھی حکومت ہی کی کارگزاری رہی ہے۔ حکومتوں نے امت کے لئے اتحاد کو ضروری اور لازم سمجھنے کے بجائے اس اتحاد کو اپنے لئے ایک عظیم خطرہ تصور کیا ہے اور اسی ایک سبب سے ان اختلافات کو ہوا دیتی رہی ہیں۔

ہمارا مقصد شیعہ سنی نزاع کی بنیادوں کا تلاش کرنا ہے کہ یہ نزاع نہ جانے کتنی صدیوں سے اسی طرح چلی آرہی ہے اور کسی دور میں کوئی ایسا مصلح نہیں پیدا ہوا ہے جو باہمی غلط فہمیوں کو دور کر کے امت کو ایک مرکز پر جمع کر دیتا اور قرآن کریم کے اس پیغام کی تبلیغ کرتا جس میں اتحاد کو ایک

اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

ہماری نظر میں اس اختلاف کے دو بنیادی اسباب ہیں:۔

۱۔ مسئلۂ خلافت۔ بحث یہ ہے کہ نبی کریمؐ کے بعد اس شریعت کی ذمہ داری کو سنبھالنے والا انسان کیسا ہونا چاہئے؟ اس کے اوصاف و کمالات کیا ہونے چاہئیں؟

شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جانشین پیغمبرؐ کو تمام نقائص سے پاک و پاکیزہ اور تمام عیوب سے بری ہونا چاہئے اور ایسی صفتیں سوائے چند مخصوص افراد کے کسی اور شخص میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اہلسنت اس خیال سے کسی طرح متفق نہیں ہیں۔

۲۔ حکومت کی دخل اندازی۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ حکومتِ وقت اپنے اندر وہ صلاحیت نہیں پاتی تھی جسے شیعوں نے اسلامی حاکم اور مذہبی رہنما کے لئے قرار دی تھی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ شیعہ کسی دوسرے حاکم کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں ہیں اور نہ اس کی کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں۔

وہ اس مسئلہ میں ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف اس کا ذاتی کردار تھا جس میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہ تھا اور دوسری طرف شیعوں کا عقیدہ تھا جو اسے سراسر ناجائز اور غاصب ٹھہرا رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں حکومت کو اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے شیعوں کو ایک حزب مخالف کی حیثیت دینا ہی چاہئے تھی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اپنے خلاف ہر قانون کے اظہار پر پابندی عائد کرنا شروع کر دی۔ شیعی عقائد حکومت کی تائید سے بالکل مجبور تھے۔ ان کا مطالبہ فکر کی آزادی، نیت کی سلامتی، ارادے کی پاکیزگی اور عقائد کی صحت کا تھا اور حکومت اسے پورا نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ ان کے بارے میں اپنے رویہ کو سخت کر دے۔

چنانچہ اس نے مختلف حالات میں متعدد طریقے اختیار کئے۔ کبھی یہ خطرہ سامنے آیا کہ یہ عقائد عوام میں اثر کر جائیں گے؟ کبھی یہ بات پریشان کن ثابت ہوئی کہ یہ اقلیت ایک دن اکثریت بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ امت میں نئے نئے اختلاف

پیدا کرائے جائیں۔ انھیں باہمی جھگڑوں میں لگا دیا جائے شیعوں کو ایک ایسی صورت میں پیش کیا جائے
جسے اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ان پر جماعت کی مخالفت اور عقائد کی کمزوری کا الزام لگایا جائے تاکہ
ان کا اعتبار قائم نہ ہو سکے۔ چنانچہ تہمتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ خلاف واقع بیانات عام ہونے
لگے۔ عوام کے ذہنوں میں اپنے خود ساختہ الزامات اتارے جانے لگے اور ان الزامات کی کوئی
حد بھی معین نہ کی گئی۔ بلکہ ہر دور کی ضرورت کے لحاظ سے ویسے ہی الزام تراشے گئے۔

سلطنت کا منشا یہ تھا کہ آزادئ فکر کو سلب کر کے ہر شخص کو حکومت کے افکار کا ترجمان بنا
دیا جائے۔ لوگوں کے خوف و ہراس کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ منصور نے امام مالک سے پوچھ لیا
رسول اللہ کے بعد سب سے بہتر کون تھا؟ تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔ اس لئے کہ حقیقت کا تقاضا
یہ تھا کہ سچ کہیں ا حالات کہہ رہے تھے کہ سچائی میں سختیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ جیسا کہ طلاق کے مسئلہ
میں دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے منصور کے نفسیات کا جائزہ لے کر یہ جواب دے دیا کہ حضرت ابوبکر
اور ان کے بعد حضرت عمر ـــــ منصور یہ جواب سن کر خوش ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہی امیر المومنین کی
بھی رائے ہے۔ یعنی میں بھی اسی کا قائل ہوں۔

ظاہر ہے کہ جب امیر کی یہ رائے ہے تو عوام میں مخالفت کی طاقت کہاں ہو سکتی ہے؛
اس رائے کی مخالفت کرنا اپنی جان کو عذاب میں ڈالنے کے مرادف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کے درمیان تفضیل کا مسئلہ بھی حکومت کی ایک سیاست کا نتیجہ
تھا۔ ورنہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ علیؑ کو پست قرار دینے والے مطمئن رہیں۔ اور ان کی فضیلت کے
قائل کافر، بدعتی، بے دین اور رافضی خبیث کے الفاظ سے یاد کئے جائیں۔

اس کا تو کھلا ہوا مطلب ہے کہ حکومت نے اس مسئلہ کو حضرت علیؑ کے دوستوں پر مصائب
ڈھانے کا ایک وسیلہ بنایا تھا اور اسی بنا پر ان کی رائے کو بدترین رائے تصور کیا گیا تھا۔

جب ہم واقعات کو آزاد فکر کے ساتھ بغیر کسی مغالطہ اور تعصب کے ایک واقعہ کی حیثیت سے
دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء کی ترتیب کسی اعتبار سے بھی ایک کے دوسرے سے بہتر
ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی ہے۔

یہ ایک اندھی تقلید اور قدیم اقتدار پرستی کی میراث ہے جسے مسلمان سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔

حکومت نے عقائد کو اپنے قانون کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایسے بے شمار مسائل ایجاد کئے ہیں۔ مامون نے لوگوں کو جبراً قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ تسلیم کرایا اور اس پر کفر سازی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔

متوکل نے اس کے بعد آکر اس کے پورے منصوبے کو پامال کر دیا اور لوگوں میں قرآن کے قدیم ہونے کا مذہب رائج کر دیا۔

قادر عباسی نے ۴۲۲ھ میں معتزلہ کو قرآن کے مخلوق ہونے پر کافر قرار دیا اور اس سلسلہ میں ایک کتاب تالیف ہوئی جو ہر جمعہ کو سنائی جاتی تھی۔ لوگوں کو اعتزال اور تشیع سے توبہ کرا کے تسنن کے طریقہ پر مجبور کیا گیا۔ سلطان محمود کو یہ فرمان بھیجا گیا کہ خراسان میں سنیت کو رائج کرے۔ چنانچہ اس نے بھی اس سلسلہ میں بے شمار معتزلہ اور شیعوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ان لوگوں پر منبروں سے لعنت کی جائے۔ یہ واقعہ ۴۰۸ھ کا ہے۔ (شذرات الذہب ۳ ص۱۸۶)

ادھر ۴۰۲ھ میں عباسی قصر حکومت سے یہ قانون نکلا کہ علویین کو حضرت علیؑ کی ولدیت سے الگ کر دیا جائے اور ان کے نسب پر اعتراض کیا جائے۔ (تاریخ ابن فدا ۲ ص۱۵۰) چنانچہ یہ قانون نشر ہوا اور اس پر علماء بغداد سے دستخط بھی لئے گئے۔

حکومت کا مقصد ان تمام باتوں سے کسی مسئلہ کی تحقیق نہ تھا بلکہ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ امت اسی طرح باہمی اختلافات کا شکار رہے اور وہ اپنا کام چلاتی رہے۔ ورنہ تحقیق کو جبر و استبداد سے کیا تعلق؛ اس کے لئے تو خیال کی آزادی اور فکر کی حریت انتہائی ضروری ہے جو کسی وقت بھی میسر نہ ہو سکی۔ حکومت نے اپنے اس طرزِ عمل سے پورے اسلامی معاشرہ کو تباہ کر دیا اور مسلمانوں کا کام سوائے لڑائی جھگڑوں کے اور کچھ نہ رہ گیا۔

حکومت وقت شیعوں کے موقف کو ہمیشہ حزب مخالف کی حیثیت دیتی رہی۔ اور اس کا منشاء یہ رہا کہ ان کو تباہ کر کے آل محمدؐ کا نام مٹا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے تشیع کو ایک عظیم جرم اور بدترین

تہمت بنا دیا۔ حد ہوگئی کہ علامہ زمخشری صلوٰۃ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اہلبیتؑ پر تنہا صلوٰۃ بھیجنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ صلوٰۃ ذکرِ پیغمبرؐ کا طریقہ ہے اور ذکرِ اہلبیتؑ سے رافضیت کا اتہام آتا ہے۔ اور آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ایماندار کو تہمت کی جگہوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔"

اس قسم کے بے شمار فتوے ایسے ہیں جن میں حکم شریعت کی صرف اس بنیاد پر مخالفت کی گئی ہے کہ اسے شیعوں نے اپنا لیا ہے اور اس سے رافضیت کا الزام آتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ رافضیت اس دور کی اصطلاح میں محبت اہلبیتؑ ہی کا دوسرا نام تھا۔ جیسا کہ امام شافعی نے اپنے اشعار میں کہا ہے کہ "جب کسی مجلس میں علیؑ و فاطمہؑ یا ان کی اولاد کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس ذکر کو چھوڑو یہ رافضیوں کی باتیں ہیں۔ اللہ مجھے ایسے لوگوں سے بچائے جو فاطمیین کی محبت کو رافضیت کہتے ہیں۔"

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں "لوگ مجھے رافضی کہتے ہیں۔ حالانکہ رافضیت نہ میرا دین ہے اور نہ میرا اعتقاد۔ میں تو ایک بہترین امام اور بہترین ہادی کو دوست رکھتا ہوں۔ اب اگر یہی رفض ہے تو میں سب سے بڑا رافضی ہوں۔

خطیب بغدادی نے فتح بن شخرف کا یہ لطیفہ نقل کیا ہے کہ اس نے عالم خواب میں دو آدمیوں کو دیکھا اور اپنے قریب والے سے پوچھا کہ تم کون ہو؟

اس نے کہا کہ اولاد آدم! یہ کہتا ہے کہ اولادِ آدم تو سبھی ہیں، تمھارے پیچھے کون ہے؟ اس نے کہا علیؑ بن ابی طالبؑ۔

فتح نے کہا کہ تم ان سے پوچھتے نہیں ہو؟

اس نے کہا کہ رافضیت کے الزام سے ڈرتا ہوں۔ (تاریخ خطیب ۱۲ <u>۲۵۱</u>)

فضل بن دکین میں کسی قدر تشیع پایا جاتا تھا تو ایک دن اس کا لڑکا روتا ہوا آیا۔ انھوں نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ لوگ مجھے شیعہ کہتے ہیں۔ فضل نے برجستہ یہ شعر کہے:" مجھے تیری محبت جواب دینے سے روک رہی ہے اس لئے کہ چغل خوروں کا خطرہ بہر حال موجود ہے۔" (تاریخ بغداد ۱۲ <u>۳۴۶</u>) آپ یہ جانتے ہیں کہ اس بچے کے رونے کا سبب کیا تھا؟ بات صرف یہ تھی کہ وہ اس تہمت سے باپ کے قتل ہونے، مال کے غصب ہونے اور گھر کی تباہی کا خطرہ

محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کہ اس دور کے قانون میں شیعیت کی یہی سزا تھی۔

ابراہیم بن ہرثمہ نے مدح اہلبیتؑ میں چند اشعار کہے۔ "مجھے کب تک اہلبیتؑ کی محبت پر ملامت کی جائے گی۔ یہ سب صاحبِ شریعت، دخترِ پیغمبرؐ کی اولاد ہیں۔ میں ان کی محبت کے بعد صحرائی جانوروں کی پروا نہیں کرتا ہوں۔"

اس کے بعد منصور کے پاس آئے تو اس نے کوئی توجہ نہ کی اور یہ کہا کہ میری نظر میں تم ایک عظیم انسان تھے اگر تم نے یہ شعر نہ کہے ہوتے۔ لہذا توبہ کرو۔

انھوں نے بھی اپنی جان بچانے کے لئے معافی مانگ لی تو منصور نے کہا کہ آیندہ اس قسم کا اقدام کروگے تو اس کی سزا قتل ہے۔

اب یہ حالت تھی کہ مدینہ میں ابراہیم کو ایک علوی نے سلام کیا تو انھوں نے کہا کہ "دور ہٹ جاؤ، میرا خون نہ بہاؤ۔" (تاریخ بغداد ۶ ۱۲۷)

منصور نمیری نے چند شعر کہے: "افسوس کہ آلِ نبیؐ اور ان کے چاہنے والے قتل کا خوف محسوس کر رہے ہیں جب کہ یہود و نصاریٰ چین کی زندگی گذار رہے ہیں۔"

ہارون رشید کو یہ اطلاع ملی تو اس نے ایک آدمی ان کے قتل کے لئے بھیج دیا۔ اس نے آکر خبر دی کہ وہ تو مر چکے ہیں۔ رشید نے چاہا کہ لاش کو قبر سے نکال کر جلا دیا جائے لیکن بعد میں اپنے اس ارادے کو ترک کر دیا۔ (زہر الآداب ج۲ ص۷)

ابن تراپا کی زبان صرف اس لئے کاٹ دی گئی کہ وہ آلِ محمدؐ کی مدح کرتے تھے اور مقدمہ میں فردِ جرم یہ عائد کی گئی کہ مدحِ علیؑ سے صحابہ کی توہین ہوتی ہے۔ کاش معاملہ اتنی ہی سزا پر ختم ہو جاتا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور لوگوں نے ان پر پتھراؤ کیا۔ وہ دجلہ میں کود پڑے تو ان کی لاش نکال کر جلا دی گئی جس کے بعد شیعوں اور سنیوں میں ایک عظیم معرکہ ہوا۔" یہ واقعہ ۵۷۶ھ کا ہے۔ (شذرات الذہب ۴ ۲۴۶)

حسن بن محمد بن ابی بکر پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے صحابہ کو برا بھلا کہا تو قاضی شرف الدین مالکی نے ان کی گردن اڑا دینے کا حکم دے دیا۔ "یہ حادثہ سوق الخیل دمشق میں جمادی الاول ۷۴۴ھ میں رونما ہوا۔" (شذرات الذہب ۶ ۱۴۴)

تاریخ اس قسم کے حادثات سے بھری ہوئی ہے۔ ہمیں تو حکومت کے طرزِ عمل کی نشاندہی کر کے اس مسئلہ کو حل کرنا تھا کہ شریعتِ اسلام میں کسی مسلمان کا خون بہانا بہت بڑا جرم ہے۔ اس لئے جو حکومت بھی اپنے نظام کو شرعی کہتی ہے اس کو شریعت کی مخالفت سے بچنے کا راستہ نکالنا چاہئے۔ جیسا کہ مختلف مقامات پر کیا بھی گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شیعوں پر ان مظالم کے لئے کیا جواز نکالا گیا؟

کیا اس وقت امت میں ایسے علماء نہ تھے جو کتاب و سنّت کی مخالفت اور مسلمان کی خونریزی پر حکومت کو متنبہ کرتے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ حکومت نے حفاظتی تدابیر کے لئے چند چیزیں مہیا کر لی تھیں۔

۱۔ عام صحابہ کو بلند کیا جائے اور ان کے بارے میں ہر نقد و تبصرہ حرام ہو۔ وہ ایک قسم کے معصوم مانے جائیں، ان کے مواخذہ کو پیغمبرِ اسلام کی توہین قرار دیدیا جائے۔ چنانچہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ رشید کے دربار میں ابوہریرہ کی یہ حدیث بیان ہوئی کہ "حضرت موسیٰ نے حضرت آدم سے ملاقات کی تو کہا کہ آپ نے ہم سب لوگوں کو جنّت سے نکلوادیا۔" تو یہ سن کر قرشی نے اعتراض کیا کہ حضرت موسیٰ نے حضرت آدم سے کب ملاقات کی تھی؛ جس پر رشید نے تلوار و تازیانہ طلب کر لیا اور کہا کہ یہ کافر حدیثِ پیغمبرؐ پر اعتراض کرتا ہے۔ (تاریخ بغداد، ۹۴) اس طرزِ عمل نے امّت کے ذہن پر لگام لگادی اور ان کی فکر پر پہرے بٹھا دیئے۔ اب ہر ایک کا فرض تھا کہ یا حکومت کی پیروی کرے یا زندیق بن کر قتل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ شیعہ اس قانون کا احترام نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا حکومت کے پاس ان کے قتل کا جواز واضح تھا۔

۲۔ شیعہ اپنے عقائد میں اہلبیتؑ کو مرکز قرار دیتے تھے۔ شعائرِ دین کی حفاظت کرتے تھے اس لئے انھیں کافر بنانے کے لئے حکومت کو غالیوں کا سہارا لینا پڑا اور اس نے یہ مشہور کرا دیا کہ یہ لوگ اہلبیتؑ کو خدا سمجھتے ہیں اور اس شہرت کے لئے تمام ضمیر فروش واعظوں کو وسیلہ بنایا جو بظاہر تو دیندار تھے لیکن باطنی طور پر پکے بے ایمان تھے۔

۳۔ شیعہ اہلبیتؑ کی محبت اور ان کے اتباع میں ایک عام شہرت کے مالک تھے۔ حکومتوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اربابِ فکر پر واعظوں کے گڑھے ہوئے کفر کے فتوے اثر انداز نہیں

ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے الگ سے کوئی نسخہ تیار ہونا چاہئے۔ ان کے پیشِ نظر وہ تمام صحیح حدیثیں بھی تھیں جن میں اہلبیتؑ اور ان کے شیعوں کے فضائل بیان کئے گئے تھے۔ اس لئے حکومت نے یہ دیکھا کہ ان حدیثوں کا بیان کرنا یا ان کا عوام کے ذہنوں سے مٹا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس نے ایک نیا حربہ ایجاد کیا کہ انھیں روایتوں کے ساتھ ضمیمہ بھی ملا [illegible] دئے، تاکہ عوام اصل حدیث کی شہرت کو دیکھ کر ان افسانوں پر بھی ایمان لے آئیں۔

اہلبیتؑ کی فضیلت کی جن حدیثوں میں اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ یا علیؑ تمھارے دوست صرف مومن ہیں اور تمھارا دشمن صرف منافق ہوگا۔ (صحیح مسلم، ترمذی ۲ ۲۹۸، مسند احمد ۲ ۱۰۲)

۲۔ اے علیؑ تم اور تمھارے شیعہ اللہ کی بارگاہ میں خوش و خرم جاؤ گے اور تمھارے دشمن عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ (صواعق محرقہ ص۹۳)

۳۔ جو حسنؑ و حسینؑ اور ان کے والد بزرگوار اور ان کی والدہ گرامی کو دوست رکھے گا وہ جنت میں میرے درجہ میں ہوگا۔ (حاکم ۲ ۱۴۹، مسند احمد ۲ ۲۵)

۴۔ "علیؑ کی محبت" نفاق اور جہنم دونوں سے بچاتی ہے۔ علیؑ کے شیعہ کامیاب ہیں۔ (کنوز الحقائق)

۵۔ جو میری جیسی زندگی، میری جیسی موت اور جنت کی سکونت کا طالب ہے اسے چاہئے کہ علیؑ کو ولی بنائے اس لئے کہ وہ نہ کسی کو ہدایت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ گمراہی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ (مستدرک ۲ ۱۲۶)

۶۔ علیؑ اور ان کے شیعہ روزِ قیامت کامیاب ہیں۔ (کنوز الحقائق)

۷۔ آیتِ مودّت نازل ہوئی تو لوگوں نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا کہ وہ اقربا کون ہیں جن کی محبت واجب کی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے دونوں فرزند۔ (ذخائر العقبیٰ ص۵۲)

۸۔ اے علیؑ تم اور تمھارے شیعہ جنتی ہیں۔

۹۔ اے ابوالحسنؑ تم اور تمھارے شیعہ جنت میں ہوں گے۔

۱۰۔ اے علیؑ تم اور تمھارے شیعہ حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے۔

۱۱۔ جب یہ آیت نازل ہوئی "جو لوگ ایمان اور عمل صالح والے ہیں وہ بہترین مخلوق ہیں" تو رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اے علیؑ یہ تم اور تمھارے شیعہ ہیں جو روزِ قیامت بارگاہِ الٰہی میں خوش و خرم پیش ہوں گے۔ (خطیب بغدادی ۱۲ <u>۳۵۸</u>)

حدیثِ ثقلین، حدیثِ غدیر اور حدیثِ سفینہ کے علاوہ یہ چند احادیث تھیں جن میں رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ اور دیگر اہلبیتؑ کی محبت کا حکم دیتے ہوئے ان کے اتباع کو واجب و لازم قرار دیا تھا۔

اس کے بعد جعلسازی کا کاروبار شروع ہوا تو مذکورہ بالا حدیثوں کے لئے اضافے تیار کئے گئے۔

۱۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ اے علیؑ تم اور تمھارے شیعہ جنتی ہیں۔

فضل بن غانم نے یہ اضافہ کیا "اے علیؑ تمھارے ہی دوستوں میں سے ایسے ہی اشخاص ہیں جن کا اسلام صرف زبانی ہے۔ جن کی تلاوتِ قرآن حلق کے نیچے نہیں اترتی ہے۔ ان کا لقب رافضی ہے۔ یہ جہاں مل جائیں تم ان سے جہاد کرو، اس لئے کہ یہ سب مشرک ہیں" (تاریخ بغداد ۱۲ <u>۳۵۸</u>)

ابو یحییٰ الحمانی نے حضرت علیؑ کی زبان سے اضافہ کیا کہ "میں نے آنحضرت سے پوچھا کہ ایسے لوگوں کی پہچان کیا ہے؟ تو فرمایا کہ وہ تمھاری بیجا تعریف کریں گے اور میرے اصحاب کو برا کہیں گے"۔

دوسری روایت یہ بنائی گئی، یہ تمھاری محبت کے دعویدار ہوں گے۔ قرآن ان کے حلق سے نہ اتر سکے گا۔ ان کی علامت یہ ہوگی کہ وہ ابوبکر اور عمر کو برا کہیں گے۔

تیسری شکل یہ تیار ہوئی "اے علیؑ ایک قوم رافضی نام پیدا ہوگی۔ وہ جہاں نظر آجائے اسے قتل کر دو اس لئے کہ وہ سب مشرک ہیں۔ (الاشاعۃ فی اشراط الساعۃ)

۲۔ حدیثِ ثقلین میں یہ ترمیم کی گئی کہ عترتی کی جگہ پر سنتی کا لفظ رکھ دیا جائے۔ حکومت کے پرستاروں نے

اس ترمیم واضافہ کا کام کیا اور حکومت نے اسے مشہور کرنے کے انتظامات کیے اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ باتیں عوام کے ذہنوں میں اتر گئیں۔ علماء نے پوری صراحت کے ساتھ ان باتوں کا انکار کیا اور یہ واضح کر دیا کہ یہ سارے راوی جھوٹے ہیں۔

فضل بن غانم مروزی۔ کردار کا پست، دین کا کمزور اور روایات میں غیر مقبول ہے۔ حافظوں نے اس کی حدیثوں کو ترک کر دیا ہے اور انھیں قابلِ نقل نہیں سمجھا ہے۔ دار قطنی نے اسے ضعیف اور یحییٰ بن معین نے اسے کالعدم قرار دیا ہے۔ (لسان المیزان ۴ ۴۴۵، تاریخ بغداد ۱۲ ۳۵۷)

سوار بن مصعب ہمدانی۔ یحییٰ بن معین کی نظر میں کالعدم، بخاری کے نزدیک منکر الحدیث، نسائی کے یہاں متروک، ابوداؤد کی زبان میں غیر معتبر اور حاکم کی اصطلاح میں مجہولات کا راوی ہے۔ (لسان المیزان ۳ ۱۳۸)

ان کے علاوہ ابوجناب کلبی، سوید بن سعید جیسے نہ جانے کتنے راوی ایسے ہیں جن کا کذب وافترا علماء کی نظر میں مسلمات میں ہے اور اسی لئے ابن حجر، ابن تیمیہ، شوکانی اور خطیب بغدادی نے ان اضافوں کو باطل قرار دیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ علماء اور ماہرینِ حدیث ان اضافوں کو لغو ومہمل کہہ رہے ہیں اور بعض متعصب، فرقہ پرست اور تفرقہ انداز افراد امت میں پھوٹ ڈالنے کے لئے انھیں روایتوں کو اپنا سہارا بنائے ہوئے ہیں اور آج بھی حکومت کی غلط تائید اور شیعوں پر ناروا الزام کا بزعم خود اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ حکومتِ وقت نے اس قتل وغارت کو اپنے مخالفین کے لئے ایک بنیادی قانون بنا دیا تھا۔ کسی انسان کے لئے ان کے خلاف کوئی رائے دینا یا ان کے مقصد سے ناسازگار روایت بیان کرنا ایک امرِ محال تھا۔ خصوصاً اس وقت جب اس کے دو ایک دشمن بھی نکل آئیں جو حکومت کے دربار تک ان باتوں کی اطلاع پہنچا دیں اور وہاں سے قتل یا قید کا فرمان نافذ کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس قانون کا بعض غیر شیعہ مفکرین کو بھی شکار بننا پڑا۔ صرف اس بنیاد

پر کہ انھوں نے اپنی رائے میں تعصب اور تنگ نظری سے کام لئے بغیر حقیقت کا صاف صاف اعلان کر دیا تھا۔

ظہیر الدین اردبیلی نے منبر پر مدح صحابہ کے واجب نہ ہونے کا فتویٰ دے دیا تو انھیں گرفتار کر کے قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی نے سزائے موت سنادی اور ان کی گردن کاٹ دی گئی۔ اس کے بعد ان کا سر قاہرہ میں باب زویلہ پر لٹکا دیا گیا۔ (شذرات الذہب ۷، ۱۷۳)

ایک قاضی نے خلیفہ مقتدر کی بیعت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بچہ ہے تو اس کے قتل کا حکم جاری ہوگیا اور دمشق میں بھرے مجمع میں اس کا سر کاٹ لیا گیا۔

حنبلی عالم اور مدرس ابوالعباس سلیمان بن عبدالقوی المتوفی ۷۱۶ھ پر رافضیت کا الزام لگایا گیا تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ ایک آدمی حنبلی، رافضی، ظاہری، اشعری کیا کیا ہوگا! یہ تو عجیب وغریب بات ہے لیکن اس کے باوجود انھیں سزا دیدی گئی۔ صرف اس لئے کہ انھوں نے یہ شعر کہا تھا" اس شخص میں جس کی خلافت مشکوک ہو، اور اس شخص میں جس کی خدائی کا شبہ ہو بڑا فرق ہے"

دوسرا الزام توہین شیخین کا لگا اور وہ اس بنیاد پر کہ انھوں نے شرح اربعین میں یہ عبارت لکھ دی تھی کہ علماء کے اختلاف کا سبب روایات کا تعارض واختلاف ہے۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روایات کے اختلاف کا سبب حضرت عمر بن الخطاب ہیں۔ اس لئے کہ صحابہ کرام نے روایتوں کو مرتب کرنا چاہا تھا اور انھوں نے روک دیا تھا۔ حالانکہ رسول اعظمؐ کے یہ ارشادات موجود تھے کہ " روایتیں لکھو۔ علم کو تحریر کے ذریعے محفوظ کرو" اگر انھوں نے یہ ممانعت نہ کی ہوتی تو آج سنت رسول ایک مرتب شکل میں ہوتی اور ہر راوی کی روایتیں اسی طرح متواتر ہوتیں جیسے بخاری ومسلم کی حدیثیں متواتر اور مشہور ہوگئی ہیں"

اس عبارت سے ان پر اتنا بڑا جرم عائد ہوا کہ وہ رافضی بنے، مارے گئے، قید ہوئے، وطن سے نکالے گئے اور تدریس کے عہدہ سے الگ کر دیئے گئے۔

(تاریخ علماء بغداد سلامی ۵۹، درر کامنہ ابن حجر)

اس سلسلے کا عجیب ترین واقعہ یہ ہے کہ علامہ مقدسی اصفہان پہنچے۔ وہاں انھیں یہ اطلاع ملی کہ یہاں ایک شخص انتہائی عابد و زاہد ہے۔ انھوں نے اپنے قافلہ کو چھوڑ دیا اور اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر بعض دیگر سوالات کے ساتھ یہ بھی پوچھا کہ صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے یہ سن کر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔

مقدسی کہتے ہیں میں نے گھبرا کر پوچھا یہ کیا؟ اس نے کہا کہ اس کا عجیب و غریب مذہب ہے۔

میں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ معاویہ کو رسول نہیں مانتا ہے۔

مقدسی نے پوچھا اور آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے آیت پڑھی کہ ہم اس کے رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے ہیں۔ اور یہ تفسیر کی کہ ابوبکر بھی رسول تھے، عثمان و علیؑ بھی رسول تھے اور معاویہ بھی رسول تھا۔

مقدسی کہتے ہیں کہ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ کہیے۔ وہ چاروں خلیفہ تھے اور معاویہ صرف بادشاہ تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ تیس سال خلافت رہے گی اس کے بعد بادشاہی آجائے گی۔ تو یہ سن کر اس نے میری مرمت شروع کر دی اور مجھے رافضی کہنے لگا۔ میں نے حالات نامناسب دیکھے اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس لئے کہ اگر اس وقت فرار نہ کرتا تو میری خیریت نہ تھی۔

(احسن التقاسیم ۲ ص ۲۹۹)

ایک مدت تک اسلامی معاشرہ اسی تنگ نظری کا شکار رہا۔ نہ خیال کی آزادی تھی اور نہ فکر کی حریت۔ نقاد تنقید کے مفہوم سے ناآشنا تھے اور معترض اعتراض کے سلیقہ سے بے بہرہ۔ تہمتوں کا بازار گرم تھا اور اسی کے ذریعہ حکومتِ وقت کو راضی کیا جا رہا تھا۔ فضیلتِ اہلبیتؑ میں حدیث بیان کرنا کفر اور صحابہ پر صحیح تنقید کرنا رافضیت اور تشیع! نتیجہ یہ ہوا کہ اس بیچ میں وہ افراد بھی پیس ڈالے گئے جنھیں تشیع سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔

حاکم، ابو عبداللہ نیشاپوری صاحب مستدرک پر شیعیت کا الزام لگا دیا گیا صرف اس بنیاد پر کہ انھوں نے حدیث طیر اور حدیث من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کو نقل کر دیا

جب ان کا نقل کرنا حکومت کی پالیسی کے بالکل خلاف تھا۔ آپ خود سوچئے کیا ایسے معاشرہ میں بھی انسان زبان کھول سکتا ہے؛ جہاں نہ عقل کے قوانین کی کوئی قدر و قیمت ہو اور نہ اسلام کے احکام کا احترام؛ شریعت، مذہب، دین، دیانت سب حکومت کے اشاروں پر رقص کرتے ہوں۔

ابن کثیر نے تاریخ کامل ۱۰ ۲۱ میں العقد الفرید کے مؤلف شہاب الدین اندلسی پر بھی شیعیت کا الزام لگا دیا اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ بڑی کٹر قسم کی شیعیت۔ صرف اتنی سی بات پر کہ انھوں نے خالد قسری کی روایتوں پر تبصرہ کر دیا ہے۔ ابن کثیر کی عبارت یہ ہے "صاحب العقد الفرید نے خالد کی طرف غلط باتوں کی نسبت دے دی ہے اس لئے کہ وہ خود پکے شیعہ اور اہلبیتؑ کے بارے میں غالی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے بیانات سے استفادہ کرنا بہت مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ علامہ ذہبی بھی ان کی طرف سے دھوکا کھا گئے اور ان کے حافظ ہونے کی مدح کر دی! صاحب العقد الفرید کا مذہب کیا تھا؛ اس کا فیصلہ تو کتاب کا مطالعہ کرنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام تہمتوں اور جھگڑوں کی بنیاد حکومت کی ذاتی خواہشیں تھیں جنھیں پورا کرنے کے لئے یہ ذرائع اختیار کئے جاتے تھے۔ حکومت کا منشا یہ تھا کہ علماء اور مفکرین بھی بھیڑوں کے ایک گلہ کی حیثیت رکھیں اور حکومت جس طرف چاہے انھیں ہنکا دے۔ ظاہر ہے کہ تمام ارباب فکر اس تحریک کی تائید نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے ان مصائب کا شکار ہو جانا اور عوام سے فکر و نظر کی آزادی کا سلب ہو جانا ناگزیر تھا۔

ان تمام بیانات سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ان تدبیروں کا عوامی ذوق پر کتنا اثر پڑا ہوگا اور اس کے نتیجے میں شیعوں سے نفرت ایک فطری جذبہ کی شکل اختیار کر گئی ہوگی۔ اب کیا تعجب ہے اگر شیعیت کو بدعت کا نام دے دیا جائے۔ اس لئے کہ یہاں بدعت کا مفہوم سنتِ رسولؐ سے مقابلہ نہیں ہے بلکہ سنتِ سیاست سے متصادم ہے۔

ورنہ اس کا کیا جواز ہے کہ شیعیت جو حضرت علیؑ کی مشایعت اور ان کے اتباع کا نام ہے اسے بدعت قرار دے دیا جائے اور پھر اس پر کوئی دلیل بھی نہ قائم کی جا سکے۔

کیا یہ طرزِ عمل پیغمبر اسلامؐ کے ان اقوال کی صریحی مخالفت نہیں ہے، جن میں حضرت علیؑ کے دوست کو مومن اور آپ کے دشمن کو منافق کہا گیا ہے ؛ جیسا کہ امام احمد بن حنبل کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ حضرت علیؑ کے قسیم الجنۃ والنار ہونے کا کیا مطلب ہے ؛ تو انھوں نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ کی مشہور حدیث ہے علیؑ کا دوست مومن اور ان کا دشمن منافق ہے اور ظاہر ہے کہ مومن کی جگہ جنّت اور منافق کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اب چونکہ دونوں کا یہ انجام علیؑ ہی کی وجہ سے ہوا ہے لہٰذا وہ قسیم الجنۃ والنّار ہیں۔

مختصر یہ کہ شیعوں کے دشمنوں نے اپنی ساری تدبیریں صرف کر دیں لیکن تاریخ میں کوئی ایک دن ایسا نہ آسکا جب اس مذہب کی اشاعت رک گئی ہو یا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے نظر آئے ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ ان مصائب و آلام کا شکار رہنے کے باوجود آج بھی یہ مذہب سارے عالم میں پھیلا ہوا ہے اور شیعوں کی تعداد تو کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اب ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم اپنے ظالموں سے سخت قسم کا محاسبہ کریں کہ انھوں نے ہمیں کس بنیاد پر متہم کیا۔ اور ہمارے سر اتنے الزامات کیوں لگائے ؛ ہمارا مطالبہ نہ کسی کی ہمدردی کا تھا اور نہ کسی کی امداد کا تھا۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے اور چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ ہمارے مسائل کا فیصلہ علم و تحقیق کی روشنی میں کیا جائے۔ ہمارے بارے میں اندھی تقلید سے کنارہ کشی کی جائے۔ اب وہ دور گیا جب فتنہ انگیزی ایک ہنر تھا اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے پر تمغہ ہائے سیاست ملتے تھے ـــــ اب عدل و انصاف، آزادی و حرّیت اور تحقیق و تنقید کا دور ہے۔ لہٰذا اس راہ میں قدم اٹھنے چاہئیں اور ہر مسلمان کو سوچنا چاہیئے کہ ان تہمتوں سے شیعوں کو نقصان پہنچے گا یا دشمنانِ اسلام کو فائدہ ؛

شیعوں کے سلسلے میں بہتان تراشی اور افترا پردازی کا فریضہ انجام دینے والوں میں ایک بڑا ہاتھ ان روایات سازوں کا بھی ہے جنھوں نے حق و انصاف کا خون کر کے روایتیں وضع کیں اور اپنا ضمیر بیچ کر مخلوق کی رضامندی اور خالق کے غیظ و غضب دونوں کو خرید لیا۔ ہم اس مقام پر زیادہ تفصیلی بحث نہیں کر سکتے ہیں لیکن کسی نہ کسی مقدار میں اس جماعت کا تعارف ضرور کرائیں گے۔

جعلساز جماعت

بہتان طرازی کے اس تلاطم اور افترا پردازی کے اس طوفان میں صدارت کی کرسی ان لوگوں نے سنبھالی جنھیں نہ دین سے کوئی واسطہ تھا اور نہ دیانت سے۔ ان کو روکنے کے لئے نہ صداقت کی طاقت تھی اور نہ انصاف کی۔ چنانچہ حکومتِ وقت کی خوشامد کے لئے روایت سازی کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہمیں اس وقت صحابہ کرام کے دور کی حالت سے کوئی بحث نہیں کرنا ہے۔ اگرچہ ان جعلسازوں نے اپنی حدیثوں کا سلسلہ انھیں کے نام سے شروع کیا ہے اس لئے کہ صحابہ کرام کی شخصیت اس بات سے بلند و برتر ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ پر کوئی بہتان رکھ سکیں۔ سوائے ان چند افراد کے کہ جن پر دنیا غالب آگئی اور انھوں نے آخرت کو دنیا کے عوض بیچ ڈالا۔ ان کا کام معاویہ کے اشاروں پر رقص کرنا تھا اور انھیں صحابیت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ بھلا وہ کون ایسا مسلمان ہوگا جو سمرہ بن جندب جیسے افراد کو بھی صحابی کہے گا۔

ہمارا مقصد اس دور کی نقشہ کشی کرنا ہے جب سیاسی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی بغض و حسد اور حبِ ریاست کے جذبات پر شباب آیا ہوا تھا اور حکومت کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو چند پیسوں میں اپنا ضمیر بیچ کر اس کے موقف کی تائید کر سکتے ہوں۔

یہی وہ ہمت افزائی تھی جس نے اس جماعت کا حوصلہ اور بھی بڑھا دیا اور حکومتِ وقت سے تقرب کی خاطر روایتیں گڑھی جانے لگیں اور افترا پردازی کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

غیاث بن ابراہیم خلیفہ مہدی عباسی کے پاس آیا اور مہدی کی خواہش پر ابوہریرہ کے نام سے یہ روایت بیان کی کہ "مقابلہ تیر اندازی، گھوڑ دوڑ کے ساتھ کبوتر بازی میں بھی ہو سکتا ہے۔" (اس لفظ کا اضافہ اِس لئے ضروری تھا کہ مہدی کو کبوتر بازی کا ذوق تھا۔) تو مہدی نے دس ہزار درہم انعام دیئے اور غیاث کے جانے کے بعد یہ بیان کیا کہ خدا شاہد ہے، رسول اکرمؐ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا تھا۔ یہ صرف مجھ سے قریب ہونے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ (تاریخ بغداد ۱۲/۱۹۳)

ابوالبختری وہب بن وہب قاضی بغداد، ہارون رشید کے پاس آیا تو دیکھا کہ ہارون کبوتر اڑا رہا ہے۔ ہارون نے اس سے پوچھا کہ کبوتر بازی کے بارے میں بھی کوئی حدیث یاد ہے؟ تو اس نے برجستہ روایت بیان کی کہ ہشام نے عروہ اور اس کے باپ کے واسطے سے حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کبوتر اڑایا کرتے تھے۔

عباسی دور میں شاہ بن بشر بن نامیان جعلسازی میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے جابر بن عبداللہ کے نام سے یہ حدیث تیار کی کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں جبریل امین سیاہ قبا پہن کر کمر سے پٹکا باندھے، خنجر لگائے ہوئے حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ یہ کیا انداز ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک دور میں ایسا ہی لباس ہوگا۔ آپ نے پوچھا کہ اس دور کا رئیس کون ہوگا؟ کہنے لگے بنی عباس۔

رشید نے ابوحذیفہ اسحاق معروف متوفی ۲۰۰ھ کو طلب کر کے یہ حکم دیا کہ مسجد ابن رغبان میں بیٹھ کر روایتیں بیان کرے۔ اسے اپنے فن کے مظاہرہ کا موقع ملا اور اس نے بھی ایسے افراد سے روایت کرنا شروع کر دی جو اس کی پیدائش سے مدتوں پہلے مر چکے تھے۔

مہدی عباسی نے ابومعشر سندی کو بغداد بلا کر اس کی یہ ڈیوٹی قرار دی کہ وہ لوگوں کو فقہ کی تعلیم دے۔ صرف اس لئے کہ ابومعشر اپنے دور کا سب سے بڑا جعلساز تھا اور ابن جزرہ نے اسے زیر آسمان سب سے بڑا جھوٹا کہا تھا۔ (تاریخ بغداد ۱۳/۴۳۱) ابومعشر نے ایک کتاب تالیف کی اور بعد کے مورخین نے اس سے استفادہ کیا۔ طبری کے اگلی معلومات اسی کے ممنونِ کرم ہیں۔

جعلسازی کا ایک محرک تو حکومت کا تقرب تھا اور دوسرا محرک جو اس کے پہلو بہ پہلو کام کر رہا تھا وہ اپنے اصولوں کی تائید اور اپنے مذہب کی امداد تھا۔ چنانچہ اس سلسلے سے بھی بے شمار

حدیثیں وجود میں آگئیں۔

نعیم بن حماد بن معاویہ المتوفی ۲۲۷ھ اس میدان کا شہسوار تھا۔ اس نے ابوحنیفہ کی منقبت اور سنّت کی تائید میں متعدد روایتیں جنم دی ہیں ـــــ ذہبی۔

احمد بن عمرو بن مصعب بن بشر نے سنّت کی تائید میں کتاب کی کتاب گڑھ دی اور اسے خراسان والوں میں کافی عام بھی کر دیا۔ یہ شخص بھی تائیدِ مذہب کے لئے جعلسازی میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ (تاریخ بغداد ۵ ۷۳)

علی بن احمد بن محمد عمرو! اس کا بھی یہی کاروبار تھا۔

احمد بن عبداللہ انصاری بھی اسی پیشہ کا آدمی تھا اور اسی نے یہ روایت گڑھی تھی کہ روزِ قیامت سفید رو اہلِ سنّت ہوں گے اور سیاہ چہرہ اہلِ بدعت۔ (شذرات الذہب ۲ ۲۶۲)

جعلسازوں کا یہ سلسلہ حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھتا رہا اور حکومت نے ان لوگوں کی مکمل سرپرستی کی۔ جن کے تین اسباب تھے۔

۱۔ اپنے مرکز کا محفوظ کرنا اور عوام کی نظروں میں اس کی عظمت واہمیت کا ثابت کرنا۔

۲۔ اپنے مقابل کو معاشرہ میں ذلیل ورسوا کر کے اس کے احتجاج کی قیمت کو گھٹا دینا۔

۳۔ عوام کو مختلف مسائل میں الجھا کر اپنی مقصد برآری کی فکر کرنا۔

ان تمام اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت شیعوں کے موقف کو حاصل تھی۔ اس لئے کہ یہی وہ قوم تھی جس نے کسی حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس سے کوئی رابطہ نہیں قائم کیا اور ہمیشہ یہ اعلان کرتی رہی کہ یہ حکومت غاصب وظالم ہے۔

ظاہر ہے کہ حکومت کو اپنے تخت وتاج کی حفاظت کے لئے اس آواز کا دبانا انتہائی ضروری تھا اور اس کام کے لئے اس جعلساز پارٹی سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ مکر و غداری، جعل وفریب کاری کا یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ شیعوں کے کفر کی بھی روایات تیار ہو گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ان کا خون حلال اور ان کا مال مباح کر لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت نہ تمام معاشرہ جاہل تھا اور نہ سب نومسلم۔ ان کے سامنے وہ حدیثیں بھی تھیں جن میں شیعوں کی مدح وثنا کی گئی تھی۔ ان کے پیشِ نظر ان کے وہ اسلامی خدمات

بھی تھے جو سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل تھے۔ اس لئے حکومت کے اس مشن کا کامیاب ہونا انتہائی دشوار تھا۔ لیکن اس کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ایک ایسا بیج بھی اسلام کی کھیتی میں بو دیا جائے جس کی بعد کے آنے والے بے دین ملاّ آبیاری کریں اور یہ درخت بار آور ہو سکے۔ چنانچہ نتیجہ بھی یہی ہوا اور اس دور کی تخم ریزی نے یہ پھل دیا کہ اسلامی معاشرہ ہمیشہ کے لئے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ امت کے اتحادی جسم میں ایک گھاؤ ہو گیا جس کا مداوا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

اس جعلساز کمیٹی کے کام بھی مختلف اسباب وعوامل کی بنا پر ہو رہے تھے۔ کوئی حکومت کی نظر میں تقرب اور دنیا کی طمع میں روایتیں گڑھ رہا تھا جس کی سرپرستی معاویہ بن ابی سفیان کو حاصل تھی۔ (شرح نہج البلاغہ ۱ ۲۵۵)

کسی کا مقصد اس نامعقول اقدام سے اپنے مذہب کی تائید اور دوسروں کے مسلک کی توہین تھا جس کے لئے عجیب عجیب حدیثیں اور نت نئے قصے تیار کئے جا رہے تھے اور مذہب انسانوں کے ایک مجموعہ کا نام بن رہا تھا۔

ایسے افراد کی فرداً فرداً نشاندہی کرنا اس وقت تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ اتنا بتانا ضروری ہے کہ علامہ امینی دام ظلہٗ نے اس کمیٹی کے ممبران کی تعداد ۷۰۰ تک شمار کی ہے۔ اور ان کی وضع کی ہوئی حدیثوں کی تعداد ۴۰۸,۳۲۴ بتائی ہے۔ (الغدیر ۵ ۲۴۵) ان حدیثوں میں سے تقریباً ۱۰۰ حدیثیں وہ ہیں جنھیں اپنے پیرؤوں کی مدح سرائی کے لئے تیار کیا گیا ہے جن میں وہ عجیب و غریب افسانے بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ حسین اور دلچسپ افسانہ ابن سبا کا ہے جو اسلام کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے اور جس میں ہر صاحب قلم کا قلم کچھ دیر تک ضرور جولانیاں دکھاتا رہا ہے۔

خدا شاہد ہے کہ یہ حالات اسلام کے لئے ایک عظیم مصیبت کا درجہ رکھتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طوفان سے نکلنا ممکن نہیں ہے؟ کیا امت میں صفائی نہیں ہو سکتی ہے؟ جب کہ یہ بلا پورے معاشرہ میں پھیل چکی ہے اور مرض متعدی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ روایتیں کسی قدر معتبر بنائی جا چکی ہیں، ان کی تائید کے لئے دیگر قصے اور نئے نئے اصول وضع ہو چکے ہیں۔ رجال

پر بحث، راویوں کی جرح و تعدیل، حق و باطل کی تمیز، عقل و ادراک کے فیصلے سب معطل ہو گئے ہیں۔ اقتدار، ہوا و ہوس، جعل و فریب، مکاری و افترا پردازی کے ہاتھ میں آچکا ہے۔

اس کا جواب حق و انصاف سے پوچھئے۔

داستان گو

داستان گو جماعت نے بھی بڑی حد تک اپنے فرائض انجام دیئے ہیں۔ مشاق قصہ گویوں نے روایتوں کی خرابیوں کو حسن بنا دیا ہے اور مہمل حدیثیں بھی بھلی معلوم ہونے لگی ہیں۔

حکومت کی امداد کے لئے مسجد سے لے کر میدانِ جنگ اور محراب سے لے کر دربارِ خلافت تک ان انسانوں کا سلسلہ پھیل چکا ہے اور اس طلسم کا توڑنا ایک ناممکن امر بن گیا ہے۔

عالم یہ ہے کہ شعبی نے ایک داستان گو کو اس حدیث کے بیان کرنے پر ٹوکا کہ "اللہ نے دو صور پیدا کئے ہیں جو دو مرتبہ پھونکے جائیں گے"۔ اور یہ کہا کہ اے شیخ خدا سے ڈر، اس نے ایک ہی صور پیدا کیا ہے تو اس بڈھے نے شعبی کو سختی سے ڈانٹا اور مارنے کے لئے چپل اتار لی۔ قوم نے بھی شیخ کا ہاتھ بٹایا اور شعبی کی اس وقت تک مرمت ہوتی رہی جب تک انھوں نے یہ قسم نہیں کھالی کہ اللہ نے ۳۰ صور پیدا کئے ہیں۔ (تحذیر الخواص سیوطی)

ایک داستان گو نے یہ حدیث بیان کی کہ جس کی زبان ناک تک پہنچ جائے وہ جنتی ہے۔ تو حالت یہ ہوئی کہ ہر شخص نے اپنی زبان نکال کر یہ تجربہ کرنا شروع کر دیا۔ (اغانی ۱۴ ص ۵)

طبری نے ایک قصہ گو کو اس کی غلط بیانی پر ٹوک دیا تو عوام نے طبری پر حملہ کر دیا۔ وہ بھاگ نکلے تو ان کے دروازے پر اتنا پتھراؤ کیا کہ ان کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔

ابن جوزی نے المنتظم میں نقل کیا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں شیعہ سنی فساد کے سب سے بڑے بانی یہی داستان گو افراد تھے جو تفرقہ پرداز قسم کی روایتیں گڑھ گڑھ کر ہم لوگوں کو لڑایا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جعلسازوں اور داستان گویوں کے ان مسلسل تخریبی اقدامات کے بعد امت کے درمیان اتحاد کا پیدا کر دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے، لیکن ہم تصفیۂ حساب کے لئے صرف

ایک بات کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ نسل کو چاہئے کہ تعصب و تنگ نظری کو دور پھینک کر شیعوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرے اور یہ دیکھے کہ مذہب جعفری نے حکومتوں کی امداد کے بغیر صرف اپنی داخلی طاقت اور اصولوں کی قوت کی بنیاد پر کس قدر ترقی کی ہے۔ اس نے اپنی راہ کی رکاوٹوں کا کس انداز سے مقابلہ کیا ہے اور اپنی ابدی زندگی کے لئے کیسا محکم ثبوت فراہم کیا ہے؟ ـــــ یہ رکاوٹیں وہ تھیں جو اگر کسی دوسرے مذہب کی راہ میں حائل ہو جاتیں تو آج اس کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ مذہب جعفری میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جس پر مواخذہ کیا جا سکے۔ یہ مذہب عقل و شعور کا ترجمان اور کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہے۔ اس نے آج تک اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے جو اپنے لچکدار اصول، گہرے قواعد، پاکیزہ اصول کی بنا پر بدلتے ہوئے زمانے اور روز افزوں ترقی کرنے والے دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔

لیکن افسوس کہ آج کے اکثر اربابِ قلم جب بھی تاریخ مذاہب پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو مذہب جعفری کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عہدِ قدیم کے محو ہو جانے والے مذاہب زیرِ بحث آجاتے ہیں لیکن مذہب جعفری کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے علماء کے اقوال نقل ہوتے ہیں اور آلِ محمد کا فرمان قابلِ ذکر نہیں ہوتا ہے۔

ہم عہدِ قدیم کے فقہاء سے کوئی بات اس لئے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک نہایت ہی ہولناک دور سے گذرے ہیں۔ ان کے زمانہ میں زبان و قلم پر پابندیاں عائد تھیں اور ہر انسان جراتِ گفتار و کردار کا آئینہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ہمیں آج کے دور میں قلم اٹھانے والے اربابِ نظر سے ضرور شکایت ہے کہ وہ ان مجبوریوں کا شکار نہیں ہیں پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھی تقلید نے ان کے ذہنوں کی فضا کو اتنا تنگ و تاریک بنا دیا ہے کہ وہ چند مذہبی مزعومات کے علاوہ کچھ سوچنا یا دیکھنا چاہتے ہی نہیں ہیں۔ ان کا ذہن آج کے اس دور میں بھی جب کہ تشیع تمام اطرافِ عالم میں پھیل چکا ہے، جب اس کے حدود سات سمندر پار کر چکے ہیں اور اس کے ماننے والوں کی تعداد ۹ کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے ـــــ اسی تاریک ماضی کا شکار بنا ہوا ہے جس میں یہ مذہب دار و رسن سے کھیل رہا تھا۔

ہمارا مطالبہ اس نئی پود سے صرف یہ ہے کہ یہ کتابوں کا مطالعہ کرکے حقیقتِ حال سے باخبر بنے اور حق و حقیقت کو قبول کرنے کے لئے اپنے ذہن کو کشادہ کرلے ــــ اس لئے کہ دورِ کہن کے پروپیگنڈوں نے دماغوں کو مدہوش اور ذہنوں کو مسموم بنا دیا ہے۔ امّت کے مصلح افراد اس مرض کے علاج سے عاجز نظر آرہے ہیں۔ مسئلہ کسی طرح بھی اتنی اہمیت کا مالک نہ تھا اور نہ شیعوں کے یہاں ایسے اصول و قواعد تھے جن سے عام امتِ اسلامیہ ناآشنا ہو یا ان پر ایمان نہ رکھتی ہو۔ شیعوں کا ایمان صرف کتاب و سنّت پر تھا اور اس میں ساری امّت متفق تھی لیکن اس کے باوجود باہمی اتحاد نہ ہوسکا۔

مقدسی نے اپنی کتاب احسن التقاسیم میں مذہب شیعہ سے عدول کے چند اسباب بیان کئے ہیں جن کا تذکرہ گفتگو کی اس منزل تک پہنچنے کے بعد انتہائی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مقدسی کا بیان

"یاد رکھو لوگوں نے حنفی مذہب کو چار مسائل کی وجہ سے ترک کیا ہے :۔

۱۔ علاوہ زبید کے نماز عیدین ، ۲۔ خرمہ کا صدقہ ، ۳۔ میّت کا وقتِ احتضار روبقبلہ کرنا ، ۴۔ قربانی کی پابندی۔

مذہبِ مالک کو بھی چار ہی مسائل کی وجہ سے چھوڑا ہے :۔

۱۔ علاوہ مغرب کے امام کے آگے نماز کا نہ ہونا ، ۲۔ روز جمعہ مصر میں جائز ہونا ، ۳۔ علاوہ مغرب کے دوشہروں کے کتّے کے گوشت کا حرام ہونا ، ۴۔ نماز سے ایک سلام پر خارج ہوجانا۔

شافعی مذہب میں بھی چار ہی باتیں ہیں :۔

۱۔ بسم اللہ کا باآوازِ بلند ہونا علاوہ مشرق میں اپنی مسجدوں کے ، ۲۔ نمازِ صبح میں قنوت ، ۳۔ تکبیرۃ الاحرام میں نیت کا اختصار ، ۴۔ ارکانِ نماز میں تکبیر ترک کرنا۔

مذہبِ داؤد میں بھی چار ہی خرابیاں تھیں :۔

۱۔ چار سے زیادہ عقد ، ۲۔ دو لڑکیوں کی میراث میں نصف حصہ ہونا ، ۳۔ ہمسایہ مسجد کی نماز غیر مسجد میں نہ ہوسکنا ، ۴۔ مسئلہ عول۔

اصحابِ حدیث سے اعراض کی بھی چار ہی وجہیں تھیں :۔

۱۔ حج تمتع ، ۲۔ عمامہ پر مسح ، ۳۔ ریگ میں تیمم کا نہ ہوسکنا ، ۴۔ قہقہہ سے وضو کا باطل ہو جانا۔

مذہب شیعہ سے بیزاری کے اسباب بھی چار ہی تھے :۔

۱۔ متعہ ، ۲۔ تین طلاقوں کا ایک شمار ہونا ، ۳۔ پیروں کا مسح ، ۴۔ اذان میں حی علیٰ خیر العمل ۔

اگرچہ یہ مسائل فقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا مفصل تذکرہ فقہی کتابوں میں موجود ہے اور ہم بھی اس سلسلے کی کسی ایک کڑی میں ان پر بحث کریں گے لیکن اس وقت مقدسی کے کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے صرف ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ امت کے ان مسائل سے کنارہ کشی اور ان کی بنا پر مذہبِ شیعہ سے بیزاری کے اسباب کیا تھے ؟ کیا واقعاً یہ چیزیں بدعت تھیں کہ ان سے برائت ضروری ہو یا ان میں بھی کوئی دوسرا عنصر کام کر رہا تھا۔ اس امر کی تحقیق کے لئے چند اشارے کافی ہیں۔

۱۔ متعہ

نکاح کی اس قسم سے عدول کرنا کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے کہ صدرِ اسلام کا یہ وہ مستحسن اقدام تھا جس کا سلسلہ دورِ رسالت سے شروع ہو کر عہدِ حضرت عمر تک باقی رہا جس کے بعد انھیں منبر پر یہ اعلان کرنا پڑا کہ دو متعہ آنحضرتؐ کے عہد میں جائز تھے اور میں انھیں حرام کر رہا ہوں جس کی وجہ سے ابن عباس کو اس مسئلہ پر کافی زور دینا پڑا اور جب ابن زبیر نے ان کی مخالفت کی تو حضرت جابر بن عبداللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ متعہ کی حدیثیں ہمارے ہی ہاتھوں سے چلی ہیں۔ یہ تو بعد کی ایجاد تھی کہ انھوں نے ہر متعہ کی مخالفت کی اور اس پر سنگسار کرنے کی دھمکی بھی دیدی۔

صحیح مسلم کے باب نکاح متعہ میں بھی اس روایت کا تذکرہ موجود ہے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ تو اس حد تک تاکید فرماتے تھے کہ آپ کا یہ اعلان تھا کہ اگر عمر نے متعہ کو حرام نہ کیا ہوتا تو سوائے بدبخت آدمی کے کوئی زنا نہ کرتا۔

عبداللہ بن عباس متعہ کو اس امت کے لئے رحمتِ پروردگار شمار کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمر

سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہم عہدِ رسولؐ اکرم میں زنا تو نہیں کرتے تھے، اسی طرح زندگی گذرتی تھی۔ (مسند احمد)

عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم لوگ سفرِ جہاد میں جنسی اعتبار سے مجبور ہو کر آنحضرت کی خدمت میں شکایت لے گئے تو آپ نے ہمارے لئے متعہ کو جائز فرما دیا ـــــ یہ کہہ کر آپ نے آیت پڑھی "اے ایمان والو! اللہ کے حلال کو حرام نہ کرو" (صحیح مسلم ۴ ۲۹)

جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ ہم لشکر میں تھے، جب حضور اکرمؐ نے آکر ہمارے لئے متعہ کے جواز کا اعلان فرمایا۔ (بخاری ۳ ۱۵۰) مختصر یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ وہ حکم ہے جس پر اپنے مخصوص شرائط کے ساتھ عمل ہونے کا اعتراف شیعہ سنی سب کو ہے۔ اختلاف خلیفۂ دوم کے عہد سے پیدا ہوا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی خاطر سنتِ رسولؐ کو ٹھکرا دیا اور بعض ان کی پرواہ کئے بغیر قولِ رسولؐ پر جمے رہے۔

متعہ کی حلیت اور اس کے جواز کے قائل اصحاب میں جابر بن عبداللہ، معاویہ، عمرو بن حریث، اسماء بنت ابی بکر، ابو سعید، سلمہ بن امیہ بن خلف اور تابعین میں سے طاؤس، عطاء، سعید بن جبیر اور جملہ فقہاء مکہ تھے۔ (نیل الاوطار شوکانی ۶ ۱۳۴)

۲۔ طلاق

علماء شیعہ اس امر پر متفق ہیں کہ بغیر رجوع کے تین طلاقوں سے عورت حرام نہیں ہوتی ہے اور نہ اسے محلل کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ اس طلاق کا شمار ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ طلاق جو عورت کو حرام کر دے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انسان طلاق دے کر زمانہ عدۃ میں رجوع کرے اور پھر دوبارہ طلاق دے کر پھر رجوع کرلے۔ اب اگر تیسری مرتبہ طلاق دے گا تو عورت اس وقت تک حلال نہ ہوگی جب تک کسی دوسرے کے عقد میں جا کر اس سے جنسی تعلقات پیدا کر کے طلاق نہ لے لے! قرآن مجید کا صریحی حکم بھی طلاق کے بارے میں یہی ہے۔

علماء اہلسنت کی اکثریت ایک ہی وقت کی تین طلاقوں کو تین شمار کرتی ہے اور اس کے بعد عورت کو حرام کر کے محلل کی تلاش جاری کر دیتی ہے۔ جب کہ عہدِ سرکارِ رسالتؐ سے لے کر ابتدائے

دورِ حضرت عمر تک ایسی کوئی بات نہ تھی جیساکہ صحیح مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسولؐ اور دورِ اوّل اور دورِ دوم کے دو سال تک یہ طلاق ایک ہی شمار ہوتی تھی۔ اس کے بعد خلیفۂ دوم نے یہ اعلان کر دیا کہ لوگ جلدی جلدی طلاق دینے لگے ہیں۔ اس لئے اب ہم اسی طلاق پر اکتفا کرلیں گے۔ (تاکہ انھیں محلل تلاش کرنا پڑے) (صحیح مسلم ۲ ۱۸۳)

اسی مسلم میں ابوالصہبار کا ابن عباس سے یہ سوال کہ کیا تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے کا سلسلہ عہدِ حضرت عمر کے تیسرے سال تک جاری تھا؛ اور ان کا اثبات میں جواب بھی مذکور ہے۔

شوکانی نے نیل الاوطار ۲ ۲۲۶ میں نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی میں ایک شخص نے تین طلاق دے دی تو آپ غصہ میں تشریف لائے اور آپ نے فرمایا کہ میری زندگی میں قرآن سے کھیل شروع ہو گیا ہے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو تین طلاق دے دی اور بعد میں پشیمان ہو کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے دریافتِ حال کے بعد فرمایا کہ ایک نشست کی تین طلاقیں ایک ہی حساب ہوتی ہیں لہٰذا انھیں رجوع کرنے کا حق ہے۔ (شوکانی ۲ ۲۲۶)

آلوسی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ علماء کے درمیان تین طلاق اور طلاق کے حالتِ حیض میں صحیح ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ شیعہ حضرات ان دونوں باتوں کو بدعت اور حرام سمجھتے ہیں۔ ان کی دلیل آنحضرتؐ کا یہ ارشاد ہے کہ جس چیز کے بارے میں ہمارا کوئی فرمان نہ ہو اسے رد کر دو۔ جس کو ابن مسیّب جیسے متعدد تابعین نے روایت کیا ہے۔

شوکانی نے اس اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ائمہ اربعہ ان طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے ہیں لیکن بعض اہلِ علم اس کے مخالف ہیں جیساکہ ابوموسیٰ، حضرت علیؑ، ابن عباس، طاؤس، عطار، رجار، ہادی، قاسم اور حضرت باقرؑ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ دورِ رسالتؐ سے ابتدا دورِ دوم تک ان طلاقوں کا ایک شمار ہونا تاریخی مسلمات میں سے ہے۔ بعد میں حضرت عمر نے اپنے ذاتی اجتہاد سے ایک کو تین بنا دیا اور امت میں ایک مستقل تفرقہ پیدا ہو گیا۔ ایک جماعت خلیفہ کی مصلحت کو حکمِ خدا و رسولؐ سے زیادہ اہم سمجھنے لگی اور دوسرا گروہ ساری مصلحت اتباعِ رسولؐ میں سمجھتا رہا اور فرمانِ خدائی کے بعد کسی کے قول و عمل کو کوئی

اہمیت نہ دے سکا۔

استاد محمد غزالی نے حقوق الانسان ص۱۷۰ میں تحریر فرمایا ہے کہ جمہور فقہاء نے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کی پیروی کر کے اس طلاق کی صحت کا فتویٰ دے دیا ہے۔ حالانکہ سنّت پیغمبرؐ قطعاً اس کے خلاف تھی بلکہ حضورؐ کا تو یہ عالم تھا کہ تین طلاق پر اظہار غیظ و غضب فرماتے تھے اور اسے ایک ہی قرار دیتے تھے۔

۳۔ پیروں کا مسح

جمہور نے معلی بن عطار کے واسطے سے ادریس ثقفی سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے وضو میں پیروں کا مسح فرمایا ہے۔ لیکن صحیح مسلم میں ایک روایت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ بھی ہے کہ ہم لوگ سفر کر رہے تھے جب نماز عصر کا وقت آیا تو ہم لوگوں نے وضو میں پیروں کا مسح کیا۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھ کر اعلان کیا کہ "پیروں کے لئے جہنّم کا خطرہ ہے"۔

اس روایت سے اکثر علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے مسح کی مذمت فرمائی ہے حالانکہ یہ کوتاہی نظر کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ علامہ قرطبی نے تحریر فرمایا ہے کہ "عام طور پر اس حدیث سے مسح کی ممانعت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل الٹی ہے۔ درحقیقت یہ دلیل مسح کے جواز کی دلیل ہے جیسا کہ بعض صحابہ اور تابعین نے اختیار فرمایا ہے۔ اس جواز کا سبب یہ ہے کہ حدیث نے پیروں کے مطلق طہارت نہ کرنے کی مذمت فرمائی ہے اور اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سفر کی حالت میں پیر کثیف ہو جاتے ہیں اس لئے بغیر طہارت کے نماز نہ پڑھنی چاہئے۔ اب اس طہارت کا کیا طریقہ ہوگا؟ اس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ (ہدایۃ المجتہد ۱ ص۱۵) (بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حضور اکرمؐ نے طریقہ بھی بیان فرما دیا ہے اس لئے کہ عبداللہ کو مسح کرتے دیکھ کر حضرت کا نہ ٹوکنا اور عبداللہ کا بغیر کسی تامل کے مسح کر لینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مسح فقط جائز ہی نہ تھا بلکہ اس دور میں ہر مسلمان کے ذہن میں ایسا رچ بس گیا تھا جس کے بعد دریافت حال کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی ـــــ مترجم)

مقصد یہ ہے کہ اہلسنت میں یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ بعض لوگ مسح کے وجوب کے قائل ہیں

ابن جریر اور داؤد ظاہری جیسے حضرات مسح اور دھونے میں اختیار کے قائل ہیں جب کہ شیعہ حضرات بالاتفاق مسح کو واجب جانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ آیت شریفہ ہے۔ وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین (مسح کرو اپنے سروں کا اور اپنے پیروں کا گٹوں تک) اس آیت میں ارجلَ کے لام پر زبر ہے اس لئے کہ اس کا عطف و تعلق رؤس سے ہے اور رؤس پر اپنے محل کے اعتبار سے زبر ہی ہے۔ اگرچہ ظاہری لفظ کے اعتبار سے زیر ہے۔ بعض لوگوں نے ارجلَ کے لام پر زبر پڑھا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق غسل دھونے والے حصہ سے ہے۔ یہاں صرف ہمسائیگی کی وجہ سے زیر آگیا ہے۔ لیکن یہ بات تین وجوہات سے غلط ہے:۔

۱۔ ہمسائیگی کے لحاظ سے زیر و زبر کا قانون ایک نادری بات ہے جسے صرف بوقت ضرورت اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اور یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ یہ قانون وہاں کارآمد ہو سکتا ہے جہاں حرفِ عطف نہ ہو اور اس آیت میں حرفِ عطف واؤ موجود ہے۔

۳۔ یہ قانون وہاں نافذ ہو سکتا ہے جہاں معنی نہ بدل سکتے ہوں اور یہاں اس قانون سے ایک مستقل نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔

اہلِ بیت معصومینؑ نے رسول اعظمؐ کی جو سیرت نقل کی ہے اس میں پیروں کے دھونے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ ابن عباس کے الفاظ میں وضو میں بنصِ کتاب دو اعضاء کا دھونا ہے اور دو کا مسح!

۴۔ اذان

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اذان میں "حیّ علیٰ خیر العمل" عہدِ رسالت سے لے کر خلیفۂ دوم کے ابتدائی دور تک باقی رہا۔ لیکن انھوں نے اپنے زمانہ میں کسی مصلحت کے تحت متعہ کی طرح سے اس میں بھی ترمیم کر دی اور اس کی جگہ الصّلوٰۃ خیر من النّوم رکھ دیا جس کے بارے میں مالک نے موطاء میں یہ روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ مؤذن حضرت عمر کو نماز صبح کے واسطے بلانے کے لئے آیا تو کیا دیکھا کہ آنجناب آرام فرما رہے ہیں۔ اس نے کہا الصّلوٰۃ خیر من النّوم

آپ کو یہ فقرہ اس قدر پسند آگیا کہ آپ نے اسے اذانِ صبح میں داخل کر دیا۔
زرقانی نے موطا کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ روایت دارقطنی نے اپنی سنن میں وکیع، عمری، نافع، ابن عمر کے واسطے سے حضرت عمر سے نقل کی ہے۔

اذان کے سلسلے میں محمد بن خالد بن عبداللہ واسطی کی اس حدیث کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضور اکرم کو لوگوں کو نماز کی اطلاع کے بارے میں سخت تردد تھا تو اصحاب میں کسی شخص نے سنکھ کا مشورہ دیا اور کسی نے ناقوس کا۔ اتفاق سے اسی رات کو عبداللہ بن زید انصاری اور حضرت عمر نے اذان کو خواب میں دیکھا اور مرد انصاری نے رات ہی میں آکر آنحضرت کو مطلع کر دیا۔ حضرت نے بھی اس طریقہ کو پسند فرمالیا۔"

اس لئے کہ اس کا راوی محمد بن خالد واسطی ہے ــــ جو یحییٰ بن معین کی نظر میں کذاب، ابوزرعہ کے نزدیک ضعیف، ابن عدی کے خیال میں منکر الحدیث اور بقول یحییٰ بدمعاش ہے۔ اس کی روایت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب حضرت حسینؑ بن علیؑ کے سامنے عبداللہ کی روایت کا ذکر آیا تو آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ وحی رسولؐ پر آتی ہے اور یہ لوگ سب خواب ہی سے ٹھیک کر لیتے ہیں۔ اذان دین کا شعار ہے۔ میں نے اپنے پدر بزرگوار حضرت علیؑ سے سنا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کو یہ طریقہ ملک کے ذریعہ معراج کی رات تعلیم دیا گیا تھا۔

مذہب شیعہ یہ ہے کہ اذان ایک خدائی فرمان ہے۔ اسے کسی کے خواب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حی علی خیر العمل اذان کا اصلی جز ہے اور الصّلوٰۃ خیر من النّوم خلیفۂ ثانی کا ذاتی اجتہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان کے فرزند عبداللہ بن عمر اپنی اذان میں حی علی خیر العمل کہا کرتے تھے اور یہی طرز عمل امامہ بن سہل بن حنیف کا تھا جیسا کہ ابن حزم نے المحلّی میں نقل کیا ہے ــــ اہلبیت کرامؑ کا یہ ایک مستقل شعار تھا اس لئے کہ ان کی نظر میں حکم رسولؐ کسی امتی کے منسوخ کرنے سے منسوخ نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت حسین بن علیؑ شہید فخ نے بھی اسے تشیع کا شعار بنا کر پیش کیا تھا۔

مختصر یہ کہ مقدسی نے جن باتوں کو مذہب شیعہ سے اعراض اور کنارہ کشی کے اسباب میں ذکر کیا

ہے۔ ان میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے بدعت کا درجہ دیا جا سکے۔ یہ سب اسلام کے ثابت و مقرر احکام ہیں جنھیں خواہشات نے پامال کیا ہے اور سیاست نے تباہی کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی ہے۔

اہلبیتؑ کا مذہب تمام تر کتاب و سنت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نہ کسی کی ذاتی رائے کو کوئی دخل ہے اور نہ اجتہاد کو۔ اس کے اصول کی تشکیل قیاس کے ہاتھوں ہوئی ہے اور نہ سیاست کے ہاتھوں۔

مگر افسوس کہ سیاست کی چالوں نے مسلمانوں کو اس نکتہ کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور تعصب نے اختلاف کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر بنا دیا۔ ہم اس داستان کو ترک کر کے ائمہ مذاہب اربعہ کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں تاکہ اہلبیتؑ کی شخصیت کو سمجھنے میں مزید مدد مل سکے اور یہ فیصلہ ہو سکے کہ امتِ اسلامیہ کو کس مذہب کو گلے لگانا چاہئے تھا۔

اس سلسلہ میں قدیم مذاہب کا ایک اجمالی خاکہ بھی پیش کر دیا جائے گا تاکہ ان کی صحیح نوعیت کا بھی اندازہ ہو جائے۔ مسلمانوں کے موجودہ مذاہب یہ ہیں:۔

۱۔ جعفری۔ اس مذہب کی نسبت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف ہے جو ۸۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۴۸ھ میں زہرِ دغا سے شہید کر دیئے گئے۔

۲۔ حنفی۔ اس کی نسبت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی کی طرف ہے جو کابل یا انسا کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص کے غلام تھے۔ یہ ۸۰ھ میں متولد ہوئے اور ۱۵۰ھ میں بغداد میں رحلت کر گئے۔

۳۔ مالکی۔ یہ مذہب مالک بن انس کی طرف منسوب ہے جو ۹۳ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے (دو برس یا زیادہ شکمِ مادر میں قیام فرمانے کے بعد) ــــ اور ۱۷۱ھ میں وفات پا گئے۔

۴۔ شافعی۔ اس کی نسبت محمد بن ادریس بن عباس بن شافع کی طرف ہے۔ شافع ابولہب کا غلام تھا جس نے حضرت عمر سے درخواست کی تھی کہ انھیں قریش کا غلام بنا دیا جائے اور انھوں نے انکار کر دیا تھا لیکن حضرت عثمان نے یہ عرضداشت منظور کر لی۔ شافعی ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۹۸ھ میں انتقال کر گئے۔

۵۔ حنبلی۔ اس کے بانی احمد بن محمد بن حنبل ہیں جنہوں نے ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہو کر ۲۴۱ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔

ہم اس جلد میں صرف امام ابوحنیفہ کے حالات کا ذکر کریں گے۔ اس کے بعد دوسری جلد میں امام مالک، تیسری جلد میں امام شافعی اور چوتھی جلد میں امام احمد بن حنبل کا تذکرہ ہوگا۔

امام جعفر صادق کے ذکر مقدس کے لئے کوئی جگہ معین نہیں کی گئی ہے۔ وہ ان تمام جلدوں میں منتشر رہے گا کہ آنحضرتؐ کی سیرت مبارکہ کے تمام پہلوؤں کا بیک وقت احاطہ کر لینا ناممکن ہے۔ ایک مورّخ اس مقدس زندگی کے بارے میں کتنا ہی لکھتا ہے لیکن آخر میں اپنے کو ہنوز روز اوّل کی منزل میں پاتا ہے اس لئے نہیں کہ آپ کی عظمت کے نقوش دھندلے ہیں یا آپ کی زندگی میں تحسیس و ترمیم کی ضرورت ہے یا آپ کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے بھی جذبات و عقیدت کا سہارا لینے کی ضرورت ہے بلکہ صرف اس لئے کہ آپ کے سلسلے کے حقائق و معارف، آپ کی شخصیت کے اطراف و جوانب، آپ کی اسلامی فکر پر احسانات اور امت کی ترقی کے لئے مسلسل جہاد پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک غیر معمولی وقت اور استعداد کی ضرورت ہے۔

کاش یہ امت اپنے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر امام علیہ السّلام کی شخصیت کا کچھ بھی حق ادا کر دیتی۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا لیکن پھر بھی خدائی امداد اور اصول و قواعد کی داخلی طاقت سے آپ کی شخصیت نمایاں ہو کر رہی اور آج بھی آپ کے ماننے والے ۱۰ کروڑ یا اس سے زیادہ تعداد میں سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ علم و حق آپ کے آثار کا اعلان کر رہے ہیں اور عدل و انصاف آپ کے فیصلہ کو منوانے کے لئے کوشاں ہیں۔

امام ابوحنیفہ

گذشتہ بیانات سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ان تمام مذاہب کی نشر و اشاعت کے اسباب وعوامل کیا تھے؟ اور اہلسنت کے دیگر مذاہب کو کس چیز نے گوشۂ گمنامی تک پہنچا دیا کہ آج ان چار مذاہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا نام بھی نہیں آتا ہے۔

تاریخ پر نظر رکھنے والے حضرات ضرور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ ان موجودہ مذاہب نے کسی سخت دشواری کا سامنا نہیں کیا اور نہ ان کی راہ میں رکاوٹیں ہی پیدا ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ آج تک صفحۂ وجود پر جلوہ گر نظر آتے ہیں ورنہ ان کی ذاتی صلاحیت اور باطنی استعداد کو سمجھنے کے لئے ان کے بانیوں کی سیرت پر نظر کرنا ہی کافی ہے۔

ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ان تمام مذاہب کے بزرگوں کے حالات پر ہلکی سی روشنی ڈال دیں جس میں نہ والہانہ عقیدت کی رنگینیاں ہوں اور نہ بغض للّٰہی کی تلخیاں۔

اس لئے کہ شخصیت کو تعصب یا جذبات کی نظر سے دیکھنے والے افراد ہمیشہ صحیح تنقید سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت ابوحنیفہ کا نام آتا ہے اس لئے کہ زمانہ کے اعتبار سے وہ سب سے مقدم تھے اور فضیلت کے اعتبار سے تقدم و تاخر کا فیصلہ ہم سے ممکن نہیں ہے یہ کام اربابِ مذہب اور عقیدت مند حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی تحقیق میں ان معاصرین کے اقوال کا سہارا لیں گے جو مریدوں کی پیدائش سے پہلے ان کے دورِ حیات کا جائزہ لے چکے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ابتدائی دور میں ان کی حیثیت کیا تھی اور انھیں کس درجہ کا آدمی تصور کیا جاتا تھا؟

ابو حنیفہ

نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۵۰ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔ ان کے دادا زوطی کابل یا نسا کے رہنے والے تھے۔ اور بعض لوگوں نے انھیں بابل کا ساکن بتایا ہے۔ جب عرب نے ان علاقوں کو فتح کیا تو وہاں سے گرفتار ہوکر آئے اور بنی تیم کے ایک شخص نے انھیں آزاد کردیا چنانچہ آزادی کی ولایت بھی اسی قبیلہ کے حصہ میں آگئی۔

ان کے نسب میں شدید اختلاف ہے۔ بعض عقیدت مندوں نے ان کو خالص عرب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے ایرانی لیکن غلام نہ ہونے پر زیادہ زور صرف کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ نسب کے اعتبار سے فارسی (ایرانی) اور حسب کے لحاظ سے غلام تھے۔ ان کے خاندان کی ولایت بنی تیم کو حاصل تھی۔

محلِ ولادت میں بھی اختلاف ہے کہ بعض ترمذ یا نسا کہتے ہیں اور بعض انبار یا کوفہ۔ آپ کے والد ثابت کے بارے میں تاریخ خاموش ہے البتہ خود آپ ہی کا ایک بیان یہ ہے کہ میں نے سنہ ۹۶ھ یا سنہ ۹۹ھ میں حج کیا تو میرے والد میرے ہمراہ تھے۔ اور اس وقت میرا سن ۱۹ سال کا تھا۔ جب ہم لوگ مسجد الحرام میں داخل ہوئے تو ایک اجتماع نظر آیا۔ میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عبداللہ بن الحارث کا حلقۂ ارادت ہے۔

لیکن بظاہر یہ بیان خلافِ واقعہ ہے۔ اس لئے کہ عبداللہ بن الحارث کی وفات مصر میں سنہ ۸۵ھ میں واقع ہوئی ہے جیسا کہ ہم آیندہ ثابت کریں گے اور اس بنیاد پر سنہ ۹۶ھ میں ان کا حج

کے موقع پر اجتماع کے بیچ میں بیٹھنا ایک غیر معمولی سی بات ہے۔

مختصر یہ کہ آپ کے والد کی تاریخ زندگی پردۂ خفا میں ہے البتہ آپ کے دادا زوطی کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے نوروز کے موقع پر حضرت علیؑ کی خدمت میں فالودہ پیش کیا اور حضرت علیؑ نے انھیں برکت کی دعا دی۔

آپ کی مادرِ گرامی کے حالات بھی ہم تک صاف طریقہ سے نہیں پہنچے ہیں۔ جو کچھ تاریخ نے نقل کیا ہے وہ صرف انھیں کی اپنی ماں کے ساتھ سعادت مندی اور حسنِ سلوک کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ مصر کے شرعی وکیل استاد السید عفیفی اپنے رسالہ میں بغیر کسی سند کے تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت ابوحنیفہ کے والد ثابت بن نعمان تھے، جو انتہائی عقل مند، دیانتدار اور زاہد تھے۔ آپ کے زہد کا عالم یہ تھا کہ ایک دن نہر کے کنارے وضو کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک سیب بہتا ہوا آگیا۔ آپ نے اسے اٹھا کر کھا لیا۔ اب جو تھوکا تو بجائے لعابِ دہن کے خون برآمد ہوا۔ فوراً دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے مال حرام کھایا ہے، ورنہ ایسا نہ ہوتا! یہ سوچ کر نہر کے کنارے کنارے چلے یہاں تک کہ ایک سیب کا درخت دکھائی دیا تو اس کے مالک کے پاس پہنچے اور سارا قصہ بیان کر کے اس سے معافی کی درخواست کی۔ اس نے زہد و تقویٰ کو دیکھ کر یہ کہا کہ میں کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میری شرط یہ ہے کہ آپ میری اندھی، گونگی، بہری، اپاہج لڑکی سے شادی کرلیں ورنہ روزِ قیامت میں آپ کا دامن پکڑوں گا۔ آپ نے خوفِ قیامت سے اس شرط کو قبول کرلیا اور عقد ہوگیا۔ اب جو اس لڑکی کے پاس گئے تو وہ ایک انتہائی حسین و جمیل عورت نظر آئی۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور شبہ میں پڑ گئے۔ واپسی کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اس نے روک کر کہا، میں تمھاری زوجہ ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ تم میں وہ صفات نہیں ہیں جو مجھ سے طے ہوئے تھے۔ اس نے عرض کی کہ میں نے گھر کے باہر قدم نہیں نکالا۔ نامحرم کا چہرہ نہیں دیکھا، کوئی غلط آواز نہیں سنی۔ اس اعتبار سے مجھے ان اوصاف سے متصف کیا گیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ ثابت شکرِ خدا بجا لائے۔"

افسوس ہے کہ وکیل صاحب نے اس واقعہ کو نقل کرتے وقت یہ فراموش کر دیا کہ بیسویں صدی کی نسل ایسے افسانوں پر ایمان نہیں لا سکتی ہے چہ جائیکہ اس افسانے سے ابوحنیفہ کی عظمت پر استدلال کیا جائے اور یہ سوچا جائے کہ "ایسے زاہد باپ اور ایسی محترم ماں سے ایسے ہی بچے پیدا ہونے چاہئیں

جن کا مذہب عالمگیر اور جن کی شخصیت آفاقی ہو۔ آپ کا نام نعمان اس لئے تھا کہ نعمان عربی زبان میں خون اور روح کے معنی میں ہے۔ گویا آپ فقہ کی روح اور اس کی جان تھے جس پر پورا نظام اسلام منحصر تھا۔"

ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ کیا ہمارے وکیل صاحب کو امام اعظم کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے کوئی اور دلیل نہ مل سکتی تھی کہ اس عجیب و غریب قصے کا سہارا لینا پڑا۔ جسے ضعیف عورتیں جاڑے کی رات میں بیان کیا کرتی ہیں اور جس کا تذکرہ ایک وکیل کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ وکیل کا کام جرح و تنقید ہوتا ہے۔ اس سے اندھی تقلید کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آج وکیل صاحب کے سامنے ایسا مقدمہ پیش آجائے تو وہ ثابت کو کس طریقہ سے مجرم ثابت کر سکیں گے؟ اور منہ سے خون آجانے کو حرام کھانے کی دلیل کیوں کر بنائیں گے؟ جب کہ ایسی کوئی بات نہ طب میں نقل ہوئی ہے اور نہ علم الحیات میں!

مناقب

حضرت ابوحنیفہ کی سیرت نگاری کے سلسلے کی سب سے بڑی دشوار منزل ان کے مناقب کی ہے کہ مناقب وفضائل ہی سے انسان کی شخصیت کا تعین ہوتا ہے اور کتب مناقب کا حال یہ ہے کہ اس میں ارادت مندوں نے اس قدر مبالغہ آمیزی اور غلو واغراق سے کام لیا ہے کہ نقاد کو قدم قدم پر ٹھہر کر حالات کا صحیح جائزہ لینا پڑتا ہے اور یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان مناقب میں کتنا حصہ حقیقت کا ہے اور کتنی حد تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اس سلسلے میں جملہ مناقب کی تنقید میں اپنا وقت صرف نہیں کر سکتے ہیں اس لئے صرف انھیں فضائل پر تبصرہ کر کے آگے بڑھ جائیں گے جن کا تعلق رسول اعظمؐ کی ذات سے ہے اور جن میں حضورؐ کی طرف سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ابوحنیفہ کے علاوہ کوئی شخص کبھی مذہبی اعتبار سے اتباع کے قابل نہیں ہے۔

اصحاب مناقب کا کہنا ہے کہ کسی مذہب کے معتقد کے لئے اس کے امام کے حالات سے باخبر رہنا انتہائی ضروری ہے۔ اسے یہ جاننا چاہئے کہ اس کا امام کون تھا؛ اس کا حسب نسب کیا تھا؛ اس کے فضائل ومناقب کیا تھے؛ اس کی زندگی کن حالات میں گذری؛ اس نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں؛ اور یہی وجہ ہے کہ ہر امام کی سیرت پر متعدد کتابیں تالیف کر دی گئیں۔

ابوحنیفہ کے سلسلے کی کتابوں میں نمایاں حیثیت ان چند کتابوں کو حاصل ہے۔ عقود المرجان، قلائد عقود الدرر والعقیان ابوجعفر طحاوی، مناقب ابوحنیفہ خوارزمی متوفی ۵۶۷ھ (اس کتاب میں

۱۴ باب ہیں) البستان شیخ محی الدین عبدالقادر بن ابی الوفا، شقائق النعمان زمخشری متوفی ۵۳۸ھ
مناقب ابی حنیفہ محمد بن کردری متوفی ۸۲۷ھ

ان کتابوں میں ہر مؤلف نے اپنے ذوق کے مطابق مختلف مناقب کو جگہ دی ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر احمد امین فرماتے ہیں کہ مذہبی تعصب نے ہر مذہب کے آدمی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ امام کے بارے میں روایتیں وضع کرے۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنے قائد کے لئے رسول اکرم کی زبانی پیش گوئیاں اور بشارتیں نقل کیں۔ اہلِ عراق کے بارے میں یہ روایت وضع ہوئی کہ "اللہ نے علم کے خزانے ان کے پاس رکھ دیئے ہیں"

ابوحنیفہ کے لئے یہ حدیث تیار ہوئی کہ "میری امت میں ایک شخص نعمان بن ثابت پیدا ہوگا جس کی کنیت ابوحنیفہ ہوگی۔ اللہ اس کے ہاتھوں میری سنت کو دوبارہ زندہ کرے گا"

اسی طرح شافعیوں نے شافعی کے لئے، مالکیوں نے مالک کے لئے آنحضرتؐ کی زبانی بشارتیں گھڑیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نقاد سیرت نگاری میں سخت مشکلات کا شکار ہو گیا اور اب کسی امام کے بارے میں صحیح رائے ایک عظیم جدوجہد کی محتاج ہو گئی ہے۔ احمد بن الصلت بن المغلس نے بشر بن الحارث، یحییٰ بن معین اور ابن المدینی کے نام سے ابوحنیفہ کے لئے متعدد فضائل و مناقب تیار کئے ہیں۔ (المنتظم ۵ ص ۱۵۶)

ایسے حالات میں ہمارا فریضہ یہ ہے کہ جن مناقب پر ساری امت ایمان لا چکی ہے اور جنہیں مسلمات کا درجہ دیا جا چکا ہے ان پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں تاکہ حقیقت اور تصنع کا فرق واضح ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں انصاف کا تقاضا کیا ہے اور عقیدت مندوں کے حوصلے کہاں تک بلند ہیں؟

بشارتیں

حنفی حضرات نے ابوحنیفہ کے بارے میں حسب ذیل بشارتیں سرکارِ دو عالمؐ کی زبان سے نقل کی ہیں:۔

۱۔ میری امت میں ایک ابوحنیفہ ہوگا جو میری امت کا چراغ ہوگا۔

۲۔ میری امت میں ایک شخص نعمان اور ابوحنیفہ کنیت کا پیدا ہوگا۔
۳۔ میری امت میں ایک شخص نعمان بن ثابت پیدا ہوگا جو میری سنت کو زندہ کرے گا۔
اگرچہ یہ روایتیں کسی تنقید کی محتاج نہیں ہیں اور ان کا خلاف واقعہ ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے لیکن چونکہ بعض علماء نے انھیں روایتوں کا سہارا لے کر مذہب حنفی کا اتباع واجب ولازم قرار دیا ہے۔ اس لئے ہمارا فریضہ ہے کہ ان میں سے ایک ایک روایت کا سلسلۂ سند ذکر کر کے اس کے راویوں کا جائزہ لیں اور یہ فیصلہ کریں کہ ان بیانات کی حقیقت کیا ہے اور ان سے مذہب کا اتباع کس طرح واجب ہوگا؟

چراغ اگرچہ اس روایت کا سلسلۂ سند طولانی ہے لیکن ہم صرف بعض راویوں کے حالات کی تنقید پر اکتفا کریں گے اس لئے کہ اتنی سی بات بھی ہمارے مدعیٰ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس روایت کی سند محمد بن سعید بورقی سے شروع ہو کر ابوہریرہ پر ختم ہوتی ہے۔ محمد بن سعید کے بارے میں علماء کے بیانات حسب ذیل ہیں :۔

ابن حجر : محمد بن سعید بڑا جعلساز تھا۔ اس نے بہت سی بے ربط حدیثیں گڑھی ہیں جن میں دو انتہائی خطرناک ہیں۔ ایک ابوحنیفہ کے لئے چراغِ امت ہونے کی روایت اور دوسرے امام شافعی کے لئے فتنۂ ابلیس سے بدتر ہونے کی حدیث ! (لسان المیزان ۵ ۱۷۹)

حمزہ سھمی : محمد بن سعید پکا جھوٹا تھا۔ اس نے خراسان میں ابوحنیفہ کو چراغِ امت بنایا اور عراق میں شافعی کو ابلیس سے بدتر فتنہ پرداز قرار دیا۔

حاکم : محمد بن سعید ایک بے حقیقت راوی ہے۔

ملا علی قاری : آپ خود بھی حنفی مسلک کے عالم تھے لیکن آپ کا بیان ہے کہ چراغ والی روایت گڑھی ہوئی ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

احیاء سنت یہ روایت مرفوع طریقہ سے نقل ہوئی ہے یعنی اس کا سلسلۂ سند رسول اکرم تک نہیں پہنچا۔

موفق خوارزمی نے اسے صحیح بنانے کی کوشش کی ہے لیکن آخرکار اس کام کے لئے موفق

محمد بن یزید نے اس حدیث کو ابوالمعلیٰ سے نقل کیا ہے اور ابن حجر نے ان دونوں کو جعلساز بتایا ہے۔ (لسان المیزان ۵ ۷)

ابان بن عیاش بصری کو یحییٰ بن معین اور عبدالرحمٰن بن مہدی قابلِ حدیث نہ سمجھتے تھے۔ فلاس نے اسے متروک قرار دیا تھا۔ احمد بن حنبل اسے متروک الحدیث جانتے تھے۔ ابو عوانہ اس سے روایت کرنے کو حرام سمجھتے تھے۔

ابن حبان کا خیال ہے کہ ابان حسن بصری کی باتوں کو انس کی روایتیں بنا دیا کرتا تھا۔ اس نے انس سے تقریباً ۱۵۰۰ روایتیں کی ہیں۔

جوزجانی نے اسے ساقط ٹھہرایا ہے۔

شعبہ کا کہنا ہے کہ گدھے کا پیشاب پی لینا ابان کا نام لینے سے بہتر ہے۔

مرہ کی نظر میں ابان سے روایت کرنے سے بہتر زنا کرنا ہے اور اس کے بارے میں خموشی بھی جائز نہیں ہے۔

احمد بن محمد جویباری کو ذہبی نے میزان میں، ابن حجر نے لسان المیزان میں اور سیوطی و خطیب بغدادی نے اپنی اپنی کتابوں میں جھوٹا قرار دیا ہے۔

خدا جانتا ہے کہ ہمارا مقصد ان تمام باتوں سے کسی انسان کی بلا سبب توہین کرنا نہیں ہے اور نہ اس سے ہمارا کوئی مفاد وابستہ ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اربابِ تحقیق کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی واضح کر دیں اور یہ بتا دیں کہ ان روایتوں کی بنا پر مذہب حنفی کو واجب العمل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض علماء اہلسنت نے بھی ان روایتوں سے اعراض کیا ہے اور انھیں قابلِ ذکر نہیں سمجھا ہے۔ جیسا کہ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں، ابن حجر نے الخیرات الحسان میں، ملا علی قاری اور ذہبی نے مناقب ابو حنیفہ میں واضح کیا ہے۔

سیوطی نے اس روایت کو چھوڑنے کے بعد ابو حنیفہ کی بشارت کو ایک دوسرے طریقے سے ثابت کیا ہے اور اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کے اس ارشاد کا سہارا لیا ہے جسے حافظ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا ہے کہ "اگر علم ثریا پر ہوتا تو بھی فارس کے کچھ افراد اسے حاصل کر لیتے۔"

لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ سرزمین فارس پر ابو حنیفہ سے پہلے بھی ایسے بلند و برتر اشخاص پیدا ہو چکے تھے جن کے بعد روایت کو ابو حنیفہ کی پیدائش کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

فریاد رس

موفق خوارزمی نے محمد حارثی کی سند سے ابوالبختری سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابو حنیفہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں آئے تو حضرت نے انھیں دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کہ "تم میرے جد کی سنت کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرو گے۔ تم ہر مصیبت زدہ کے کام آنے والے اور ہر فریادی کے فریاد رس ہو"۔

ہمیں اس روایت کے سلسلے میں صرف حضرت ابوالبختری کی شخصیت سے بحث کرنا ہے۔ اگر ان کی وثاقت و صداقت ثابت ہوگئی تو حق سے انکار کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوگا تو ہم اس روایت کو ترک کر دینے میں معذور ہوں گے۔

ابوالبختری

یہ بغداد کے قاضی وہب بن وہب قرشی کی کنیت ہے جس کے بارے میں معافی کا خیال ہے کہ ابوالبختری جہنمی ہے۔ اس نے حضرت جعفر پر بہت بڑا بہتان باندھا ہے۔

ابن العماد حنبلی نے شذرات میں ۲۰۰ھ کے حالات میں وہب بن وہب کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے کاذب ہونے کا اعلان کیا ہے۔

ابن قتیبہ نے معارف میں اسے ضعیف الحدیث سے تعبیر کیا ہے۔

یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ یہ ایک ایک پیسے میں رات بھر قصے گڑھا کرتا تھا۔ اس نے رسول اکرمؐ پر افترا کیا ہے۔ یہ انتہائی جھوٹا اور دشمن خدا تھا۔

عثمان بن ابی شیبہ کا کہنا ہے کہ یہ روزِ قیامت دجالوں میں محشور ہوگا۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کو اس کے مرنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے فرمایا کہ شکرِ خدا آج مسلمان اس کے شر سے محفوظ ہو گئے۔

ابن خلکان نے اسے جعلساز اور احمد نے جھوٹا کہا ہے۔

خطیب کا بیان ہے کہ اس نے ہارون رشید کی خاطر آنحضرتؐ کی کبوتر بازی کی حدیث فی البدیہ

گڑھ دی تھی۔ (تاریخ بغداد ۱۳ ۴۵۳، وفیات الاعیان ۲ ۱۸۲)

ابن عدی نے اس کی چند حدیثیں نقل کر کے یہ فیصلہ دیا ہے کہ یہ جعلساز اور کذاب تھا۔ ہر روایت کو بڑے بڑے موثق بزرگوں کے سر ڈال دیا کرتا تھا۔ (لسان المیزان ۶ ۲۳۱)

ابوالبختری کی اس شان و منزلت کو سننے کے بعد ایک قصہ اور سنتے چلئے تاکہ اس کی قضاوت کا حال بھی معلوم ہو جائے۔

ہارون رشید نے یحییٰ بن عبداللہ بن علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ کے نام ایک امان نامہ لکھا اور تھوڑے عرصہ کے بعد اسے باطل کرنا چاہا تو محمد بن الحسن شیبانی سے مسئلہ دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ امان نامے کو باطل نہ کرو۔ ان کا خون بہانا حرام ہے۔ اس کے بعد وہ خط حسن بن زیاد کو دیا گیا۔ انھوں نے دبے لفظوں میں کہا کہ یہ امان نامہ درست ہے۔ اتفاق سے قاضی وہب بن وہب تشریف لے آئے۔ اور انھوں نے جراب سے ایک چاقو نکال کر اسے کاٹ ڈالا اور کہا کہ یہ امان نامہ فسخ ہو چکا ہے۔ اس کی حیثیت اب کچھ نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کا بار میری گردن پر ہے۔ (مفتاح السعادہ احمد بن مصطفیٰ ۲ ۱۱۰، لسان المیزان ۲ ۲۳۴) امان نامہ کے فسخ کرنے کے فتویٰ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوالبختری کے عہدہ میں ترقی ہو گئی اور اسے قاضی القضاۃ کا منصب مل گیا اور ہارون کی طرف سے ۱۶ لاکھ درہم کا انعام بھی حاصل ہوا۔

سوید بن عمرو بن الزبیر نے اس کی تعریف اس انداز سے کی ہے کہ ابن وہب نے اپنی حدیثوں سے دین اور ایمان دونوں کو تباہ کیا ہے۔ اس پر اور اس کی حدیثوں پر تف ہے۔ (لسان المیزان ۶ ۲۳۲، میزان الاعتدال ۳ ۲۷۸، تاریخ بغداد ۳ ۴۵۴ وغیرہ)

فضائل کا جزر و مد

ابوحنیفہ کے بارے میں کہنے والوں نے اس قدر مبالغہ سے کام لیا ہے کہ نہ بیان کا اعتدال باقی رہ گیا ہے اور نہ اقوال کا توازن۔ بعض لوگوں نے قصّے اور افسانے گڑھ گڑھ کے پوری کتاب تیار کردی ہے جس کا مختصر سا خاکہ اس مقام پر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلے کا اہم ترین اور لطیف ترین واقعہ اس دہریہ سے مناظرہ کرنے کا ہے جو بغداد کے علمار اسلام سے بحث کرنے آیا تھا، اور عباسی دورِ حکومت کے تمام علمار اس کے جواب سے عاجز رہ گئے تھے جسے صاحب مفتاح السعادہ ۲ ۱۰۱ نے اس انداز سے لکھا ہے کہ "ایک رومی دہریہ علمار اسلام سے مناظرہ میں مشغول ہوا اور سب کو شکست دے دی۔ آخر میں ایک حماد بن سلیمان باقی رہ گئے جو ابوحنیفہ کے استاد تھے لیکن انھیں بھی یہ خطرہ تھا کہ اگر میں ہار گیا تو اسلام کی توہین ہوجائے گی۔ اسی اثنار میں انھوں نے ایک خواب دیکھا اور اس کے نتیجہ میں ابوحنیفہ کو لے کر جامع مسجد پہنچ گئے۔ ابوحنیفہ کے بچپنے کا زمانہ تھا۔ دہریہ منبر پر گیا اور اس نے علمار کو چیلنج کیا۔ ابوحنیفہ نے قبول کرلیا۔ اس نے انھیں حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا تو انھوں نے کہا کہ ان باتوں سے کیا فائدہ، اپنی بات بیان کرو۔ دہریہ اس جرأت سے بدحواس ہوگیا اور اس نے چند سوالات پیش کئے۔ آپ نے برجستہ سب کا جواب دے دیا اور فرمایا کہ اب تک تو سائل تھا اس لئے تو منبر پر تھا۔ اب میں سوال کرنا چاہتا ہوں اس لئے تو زیرِ منبر آ اور میں منبر پر جاؤں۔ دہریہ یہ سن کر منبر سے اتر آیا۔ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ خدا تجھ جیسے دہریوں کو منبر سے اتار دیتا ہے اور

مجھ جیسے موحدوں کو منبر پر بلند کرتا ہے ۔ دہریہ یہ سن کر مبہوت ہوگیا اور لوگوں نے اسے تہ تیغ کردیا"
راویوں نے اس افسانہ کو تیار تو کر دیا لیکن یہ سوچنے کی زحمت نہ کی کہ بغداد میں یہ واقعہ ہو کیسے سکتا ہے ۔ بغداد منصور کے عہدِ حکومت میں ۱۴۵ھ میں آباد ہوا جس وقت ابو حنیفہ کی عمر ۶۵ سال کی تھی تو بچپنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ؟
پھر ان کے استاد حماد کا انتقال بھی ۱۲۰ھ یعنی بغداد کی آبادی سے ۲۵ سال پہلے ہو چکا تھا ۔ اس لئے ان کے بغداد میں پیدا ہونے کا کیا سوال ہے ؟
اور سب سے لطیف بات تو یہ ہے کہ ابو حنیفہ نے ایک مدت تک ریشم بیچنے کے بعد حماد کی شاگردی اختیار کی تھی اس لئے بچپنے میں ان کے شاگرد ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے ۔
بعض لوگوں نے اس واقعہ میں اس جملہ کا بھی اضافہ کر دیا ہے کہ جب امام اعظم کی بچپنے میں یہ حالت تھی تو جوانی کا کیا کہنا ؛ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس واقعہ کو بچپنے ہی کا واقعہ سمجھتے ہیں ۔
خوارزمی نے اس واقعہ کو یوں نقل کیا ہے کہ "بادشاہ روم نے ایک امین کے ہاتھ بہت سا مال بغداد بھیجا اور یہ شرط کر دی کہ وہ علماء بغداد سے تین سوال کرے ۔ اگر صحیح جواب مل جائے تو مال ان کے حوالے کر دے ورنہ واپس لے آئے ۔ امین بغداد آیا اور تمام علماء کو جمع کر کے منبر پر گیا ۔ صورتِ حال کو بیان کرنے کے بعد مسائل پیش کر دیئے ۔ قوم پر سناٹا چھا گیا ۔ اتفاقاً حضرت ابو حنیفہ اپنے والد کے ساتھ موجود تھے ۔ انھوں نے مچل کر کہا کہ اجازت ہو تو میں کچھ بولوں ۔ باپ نے چپ کرا دیا ۔ آپ نے بادشاہ سے اجازت لی اور منبر پر تشریف لے گئے ۔
اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مفتاح السعادہ کے مؤلف نے یہ تحقیق کی ہے کہ جب ان کے باپ کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ نے امام جعفر صادقؑ سے عقد کر لیا اور انھوں نے امامؑ کی آغوش میں تربیت پائی اور یہ ان کی سب سے بڑی منقبت ہے ۔ قاضی زادہ شریف مخدوم نے بھی اس واقعہ کی تائید کی ہے ۔ (جامع الرموز ۲۱)
کاش ان مسکینوں نے یہ سوچا ہوتا کہ ابو حنیفہ کا سنِ ولادت ۸۰ھ اور امام جعفر صادقؑ کا سنِ ولادت ۸۳ھ ہے ۔ ایسی حالت میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ابو حنیفہ امامؑ کی آغوش میں تربیت پا کر

یہ عظیم منقبت حاصل کرلیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ سمندر میں جزر و مد کی طرح عمروں میں جزر و مد ہونے لگے۔ اس لئے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

ہم اپنے بیان کو ختم کر ہی رہے تھے کہ دو ایک لطیفے اور یاد آگئے جن میں ابوحنیفہ کا تذکرہ توریت سے ثابت کیا گیا ہے۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے ابوحنیفہ کو آواز دی کہ میں نے تمھیں اور تمھارے مذہب کے ماننے والوں کو بخش دیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت داؤد پر غبطہ کیا کہ ان کی امت میں لقمان جیسا حکیم پیدا ہوا ہے تو قدرت نے خطاب کیا کہ تمھاری امت میں ابوحنیفہ ہے جو لقمان سے کہیں بہتر ہے۔

تیسرا لطیفہ یہ ہے کہ حضرت خضر نے پانچ سال ان کی زندگی میں ان سے استفادہ کیا اور ایک عرصہ تک مرنے کے بعد۔

درحقیقت یہ تمام باتیں صرف اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ مذاہب کے باہمی مقابلے چاہنے والوں کو ان روایتوں کے وضع کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ چنانچہ احمد الحانی المتوفی ۳۰۲ھ اور اسد بن عمر البجلی المتوفی ۱۹۰ھ، ابان بن جعفر الکذاب وغیرہ نے ابوحنیفہ کے فضائل گڑھنے کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ ابان کا کذب و بہتان چونکہ زیادہ مشہور ہوگیا تھا اس لئے بعض لوگوں نے اسے ابان سے بدل دیا۔ اس نے ابوحنیفہ کی شان میں ۳۰۰ سے زیادہ حدیثیں تیار کی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱/۴۴۹)

سب سے زیادہ اہم منقبت یہ ہے کہ انھوں نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے حدیثیں سنی ہیں اور انھیں حدیثوں کے مجموعہ کا نام مسند ابوحنیفہ پڑا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک نظر اس فضیلت پر بھی ڈالتے چلیں۔

صحابہ سے سماع کی حیثیت

بعض ارباب قلم کی خواہش یہ ہے کہ ابوحنیفہ کو ایک تابعی بلکہ سید التابعین ثابت کرکے یہ ثابت کردیں کہ انھوں نے صحابہ کرام سے ملاقات کی ہے اور ان سے حدیثیں سنی ہیں جن کی تعداد پچاس ہے لیکن اکثر ارباب تحقیق نے

اس خواہش کو مسترد کر کے یہ طے کر دیا ہے کہ یہ صرف ایک دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔
ہمارے لئے مشکل یہ ہے کہ ان روایتوں کے نقل کرنے والے حنفی حضرات نے بھی اس دعویٰ کا کوئی ثبوت نہیں فراہم کیا ہے۔ پھر بھی ہم ایک ایک صحابی کی حدیث اور ان کے حالات آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں تاکہ حقیقتِ حال روزِ روشن کی طرح واضح ہو سکے۔

۱۔ عبداللہ بن انس ابو یحییٰ الجہنی۔ انھوں نے عقبہ ثانیہ اور احد میں شرکت کی، اس کے بعد مصر تشریف لے گئے۔ شام میں ۸۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ایک قول کی بنا پر معاویہ کے زمانہ میں ۵۴ھ میں انتقال کیا۔

ابو حنیفہ کی ان سے یہ روایت کہ "محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے" ناممکن ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے اعتراف کیا ہے۔ اس لئے کہ ابو حنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے جب کہ عبداللہ ۵۴ھ میں انتقال کر چکے تھے۔ (شرح مسند ابو حنیفہ ص۲۸۶)

۲۔ عبداللہ بن الحرث بن الجزء الزبیدی۔ فتح مصر میں شریک ہوئے۔ وہیں مکان بنا لیا۔ اور ۸۶ھ میں انتقال کر گئے۔ یہ مصر کے آخری صحابی تھے۔ ان سے ابو حنیفہ سے یہ روایت کی ہے کہ "میں نے ۹۶ھ میں اپنے والد کے ساتھ حج کیا تو مسجد الحرام میں ان کا حلقۂ درس دیکھا جس میں انھوں نے یہ حدیث بیان کی کہ "علم دین سیکھنے والے کا رزق غیب سے آتا ہے"۔

اس روایت کا امکان اس لئے نہیں ہے کہ یہ عبداللہ کے انتقال کے دس سال بعد کی ہے اور اس کے پہلے بھی ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابو حنیفہ نے ۹۶ھ سے پہلے کوئی حج نہیں کیا ہے۔ اور بقول شیخ قاسم الحنفی عبداللہ نے کبھی کوفہ میں قدم نہیں رکھا ہے۔

۳۔ جابر بن عبداللہ انصاری۔ ۱۹ غزوات میں شریک ہوئے اور ۵۸ھ میں انتقال فرمایا۔ ان سے ابو حنیفہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ جس کے اولاد نہ ہو وہ استغفار کرے، چنانچہ اسی استغفار سے جابر کے نو بچے پیدا ہوئے۔

یہ روایت اس لئے مہمل ہے کہ جابر کے انتقال کے وقت ابو حنیفہ بطن مادر میں بھی

نہ تھے۔

۴۔ عبداللہ بن ابی اوفی السلمی۔ صحابی بن صحابی تھے۔ انھوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی تھی۔ اور سنہ ۸۵ھ میں انتقال فرمایا تھا۔ ابوحنیفہ نے ان سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "جس نے ایک پرندے کی نشست گاہ برابر کی مسجد بھی بنا دی اسے جنّت میں گھر مل جائے گا۔"

یہ روایت اس لئے غلط ہے کہ ابوحنیفہ اس وقت نہایت کمسن تھے۔ ان میں سماع کی اہلیت نہ تھی۔ پھر انھوں نے علم دین کی طرف توجہ بھی ایک عرصہ کی بزازی کے بعد فرمائی ہے۔

۵۔ معقل بن یسار المزنی۔ انھوں نے بیعتِ شجرہ میں شرکت کی اور معاویہ کے زمانہ میں سنہ ۶۰ھ میں انتقال کیا۔ ابوحنیفہ نے ان سے یہ روایت کی ہے کہ "منافق کی تین علامتیں ہیں، بات کرے گا تو جھوٹ بولے گا، وعدہ کرے گا تو مخالفت کرے گا، امانت رکھی جائے گی تو خیانت کرے گا۔"

یہ روایت اس لئے غلط ہے کہ معقل نے ابوحنیفہ کی ولادت سے ۲۰ سال پہلے دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

۶۔ واثلہ بن الاسقع۔ جنگِ تبوک کے قبل مسلمان ہوئے۔ تبوک میں شریک ہوئے۔ اور دمشق میں تمام صحابہ کے بعد سنہ ۸۳ھ میں انتقال فرمایا جب کہ ابوحنیفہ کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ ان سے ابوحنیفہ نے دو روایتیں کی ہیں:۔

۱۔ اپنے بھائی پر طعن وطنز نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خود بھی اس مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔

۲۔ شبہ کو چھوڑ کر یقینی بات پر عمل کرو۔

۷۔ عائشہ بنت عجرد۔ ان کا نام ونشان معلوم نہیں ہے۔ ذہبی اور ابن حجر نے ان کی صحابیت ہی سے انکار کیا ہے۔ ابوحنیفہ نے ان سے روایت کی ہے کہ "ٹڈیاں اللہ کا لشکر ہیں۔ لہٰذا نہ انھیں کھا سکتا ہوں اور نہ حرام کر سکتا ہوں۔"

۸۔ سہل بن سعد الساعدی۔ ان کا نام حزن تھا، آنحضرتؐ نے سہل رکھ دیا تھا۔ انھوں نے

۸۸ھ میں مدینہ کے تمام اصحاب کے بعد دنیا سے رحلت کی۔ ابوحنیفہ کی ان سے روایت اس لئے غیر معقول ہے کہ ابوحنیفہ نے پہلا حج ۹۶ھ میں کیا ہے اور سہل اس سے ۸ سال پہلے انتقال کر چکے تھے

۹۔ انس بن مالک بن النضر بن ضمضم بن زید بن حرام انصاری۔ یہ جنگِ بدر میں شریک ہوئے اور ۹۰ھ میں بصرہ میں انتقال فرمایا۔ ظاہر ہے کہ ابوحنیفہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ ابوحنیفہ کا اصحابِ رسولؐ سے روایت کرنا ایک ایسا مفروضہ ہے جس کی ولی عراقی، ابن حجر اور سخاوی جیسے بہت سے علماء نے مخالفت کی ہے بلکہ محمد بن شہاب البزاز نے تو ان کی اصحاب سے ملاقات ہی کو غیر ثابت قرار دیا ہے۔

اس کے بعد دو الفاظ ابوحنیفہ اور اصحابِ صحاح کے بارے میں بھی سن لیجئے تاکہ ان کی روایتوں کی قدر و قیمت معلوم ہو سکے۔

احادیث ابوحنیفہ

علماء کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ کا شمار اصحابِ حدیث میں نہیں ہے۔ وہ ایک قیاسی آدمی تھے۔ ہر مسئلہ میں قیاس کیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے کافی بدنام بھی ہوئے۔

مالک بن مغول کہتے ہیں کہ مجھ سے شعبی نے اہلِ رائے کے بارے میں یہ رائے بیان کی کہ ان کی روایتوں کو قبول کر لو لیکن رائے کو گھورے پر ڈال دو۔ قیاس سے دور رہو۔ یہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر رہا ہے۔ (تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ ص۶۲)

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ ابوحنیفہ کی کل روایتیں ۱۷ ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ وہ روایت اور راوی وغیرہ میں کافی شرائط اور پابندیوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کی نظر میں روایت کے قبول کرنے کے لئے فعل نفسی کی بھی ضرورت تھی۔ (مقدمہ ص۳۷۲)

ڈاکٹر احمد امین فرماتے ہیں کہ ابن خلدون کی یہ عبارت مجمل ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ تنہا روایت پر اکتفا کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ اس کے نفسیاتی اور اجتماعی پہلوؤں پر بھی نظر کرنا ہو گی۔ (ضحی الاسلام ۳ ص۱۳۱)

وکیع وغیرہ کے اقوال دلالت کرتے ہیں۔ جامع اسانید ابو حنیفہ میں زہیر سے یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جابر اصدق الناس ہیں۔ (جامع اسانید ابو حنیفہ ۱ ۳۰۵)

جابر کا شمار ابو حنیفہ کے استادوں میں ہوتا ہے جن سے انھوں نے متعدد روایتیں نقل کی ہیں۔ ابو حنیفہ ان کے حافظے اور حاضر جوابی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے جابر سے رسول اکرمؐ کے تعقیبات کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے برجستہ یہ روایت بیان کی کہ آپ کی آخری نماز وتر ہوا کرتی تھی۔ (جامع اسانید ۱ ۳۰۵)

جابر کی تکذیب کا قول اس دور کی پیداوار ہے جب موالی اور عرب کے جھگڑے شباب پر تھے۔ اور ہر ایک اپنی فضیلت کی روایتیں گڑھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر عجم کا فریضہ تھا کہ وہ کوئی ایسی روایت تیار کریں جس سے عطا فارسی کی فضیلت ظاہر ہو اور جابر عربی کی منقصت۔

ابو حنیفہ اور احباب و اغیار

ابو حنیفہ کی زندگی پر صحیح تنقید کرنے کے لئے ان تمام اقوال کو سامنے رکھنا ہوگا جن میں ایک طرف دوستوں اور چاہنے والوں کی مدح سرائی اور مبالغہ آرائی ہے اور دوسری طرف اغیار کی تنقیدی یورش ـــــ ان دونوں پہلوؤں پر نظر کئے بغیر ان کی شخصیت کا صحیح تجزیہ ممکن نہیں ہے۔

ان کے چاہنے والوں کا یہ عالم ہے کہ وہ انھیں انبیاء کی منزل تک لے گئے ہیں۔ ان کے لئے توریت میں بشارتیں تلاش کی ہیں۔ نبی اکرمؐ کی زبان سے پیشین گوئی وضع کی ہے۔ انھیں امت کا چراغ اور شریعت کا مجدد بنایا ہے۔ قرآن کے ساتھ ایک جیتا جاگتا معجزہ قرار دیا ہے۔ اور حد ہوگئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو آسمان سے اترنے کے بعد ان کے احکام کی تقلید کا پابند بنادیا ہے اور حضرت عمرؓ کو ان کی شاگردی کا شرف بخش دیا ہے۔

قاضی زادہ کا بیان ہے کہ مذہب صرف ابو حنیفہ کا ہے اس لئے کہ اس کا اتباع انبیاء نے کیا ہے۔ حضرت خضرؑ نے پانچ سال تک صبح کے وقت ان سے علمِ شریعت سیکھا ہے اور جب ان کا انتقال ہوگیا تو خضرؑ نے بارگاہِ احدیت میں یہ استدعا کی کہ مجھے ابو حنیفہ کی قبر سے استفادہ کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اور انھوں نے پچیس سال تک مزید علم حاصل کیا۔ اس کے بعد حکمِ خدا ہوا کہ قشیری کے پاس جائیں اور انھیں تمام معلومات سکھائیں۔ قشیری نے ان تعلیمات سے ایک ہزار کتابیں تالیف کیں جو نہر جیحون کے حوالے کر دی گئیں تاکہ جب حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتریں تو انھیں کتابوں پر عمل کریں۔ (الاشاعہ فی اشراط الساعہ ص۱۴۰، الیاقوتۃ لابن الجوزی ص۴۵)

میرے خیال میں ان چاہنے والوں نے ایسے خرافات سے اپنے امام کی تعظیم کی بجائے ان کی توہین کی ہے اس لئے کہ یہ باتیں ایک صاحبِ عقل وانصاف کی نظر میں انتہائی مہمل اور غیر معقول ہیں۔

اس کے علاوہ چند خلاف طبیعت وفطرت معجزات بھی وضع کئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ ایک مقام پر بیٹھ کر، ۷ ہزار قرآن ختم کرلیا کرتے تھے۔

ہر رات دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور ہر رکعت میں پورا قرآن۔

چالیس سال تک نماز عشا کے وضو سے نماز صبح پڑھی ہے۔

دس سال تک بکری کا گوشت صرف اس لئے نہیں کھایا کہ ایک شخص کی بکری گم ہوگئی تھی اور ہر گوشت پر اس بکری کے گوشت کا گمان تھا اور بکری کی زندگی عام طور سے دس سال ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف اغیار اور نقادوں نے ان کی شخصیت پر وہ سخت تبصرہ کیا ہے جو حیرت انگیز ہے۔ کسی نے کافر، کسی نے بے دین، کسی نے فاسد العقیدہ، کسی نے مخالف کتاب وسنت، کسی نے بے ایمان، غرض ہر شخص نے اپنے ذوقِ تحقیق کی بنا پر ایک نئے لقب سے نوازا ہے۔

ایک مرتبہ سفیان ثوری، شریک، حسن بن صالح، ابن ابی لیلیٰ ایک مقام پر جمع ہوئے اور ابوحنیفہ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کرایا جس نے اپنے باپ کو قتل کیا ہو، ماں سے زنا کی ہو، باپ کے کاسۂ سر میں شراب پی ہو؛ ابوحنیفہ نے جواب میں فرمایا کہ وہ مومن ہے تو ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ اس شخص کی شہادت ناقابلِ قبول ہے۔ سفیان ثوری نے کہا کہ یہ بات کرنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ (خطیب ۱۳ ۳۷۴)

ابو یوسف سے پوچھا گیا کہ کیا ابوحنیفہ مرجۂ میں سے تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ یہی نہیں بلکہ جہمی بھی تھے۔ لوگوں نے عرض کیا، پھر جناب سے یہ تعلقات کیسے؛ جواب دیا کہ وہ ایک مدرس تھے۔ میں نے ان کی اچھی باتوں کو لے لیا ہے اور برائیوں کو ترک کر دیا ہے۔ (خطیب ۱۳ ۳۷۴)

ابراہیم بن بشار نے سفیان بن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہ سے زیادہ اللہ کی بارگاہ

میں گستاخ کوئی نہیں ہے۔ (الانتقاء ص۱۴۸)

ولید بن مسلم کہتے ہیں کہ مجھ سے مالک بن انس نے یہ سوال کیا کہ کیا تمھارے شہروں میں ابوحنیفہ کا نام لیا جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ جی ہاں! فرمایا وہ شہر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ (میزان الشعرانی ۱؍ ص۵۹)

اوزاعی کا کہنا ہے کہ ہمیں ابوحنیفہ کی رائے پر اعتراض نہیں ہے بلکہ اعتراض اس بات پر ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی حدیثوں کو تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ (تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ ص۶۳)

ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ کو مطعون کرنے والوں میں ایک امام بخاری بھی ہیں جنھوں نے ان کا ذکر ضعیف اور متروک لوگوں میں کیا ہے۔

نعیم بن حماد کا کہنا ہے کہ سفیان ثوری کے قول کے مطابق ابوحنیفہ سے دو مرتبہ کفر سے توبہ کرائی گئی ہے۔

نعیم فزاری کہتے ہیں کہ میں سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ابوحنیفہ کے انتقال کی خبر آئی۔ سفیان نے برجستہ کہا کہ یہ شخص اسلام کو تباہ کر رہا تھا۔ اس سے بدتر شخص اسلام میں نہیں پیدا ہوا ہے جیسا کہ بخاری نے نقل کیا ہے۔ (الانتقاء لابن عبدالبر ص۱۵۰)

ابن الجارود نے اپنی کتاب ضعفاء و متروکین میں لکھا ہے کہ ابوحنیفہ کی اکثر روایتیں غلط ہیں۔

امام مالک نے انھیں اسلام کا بدترین مولود قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شخص امت کو تلوار سے قتل کر دیتا تو وہ زیادہ آسان تھا ـــــ ایک مرتبہ امام مالک سے حضرت عمر کے اس قول کے بارے میں پوچھا گیا کہ "عراق میں ایک سخت مرض ہے تو انھوں نے فرمایا کہ اس سے مراد ابوحنیفہ ہے۔

وکیع بن الجراح کا کہنا ہے کہ ابوحنیفہ نے دو سو احادیث پیغمبرؐ کی مخالفت کی ہے۔

ابن المبارک سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ابوحنیفہ کے تابع ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ غلط فہمی ہے۔ میں ان کے پاس اس وقت تک جایا کرتا تھا جب تک ان کی معرفت نہ تھی۔ جب سے انھیں پہچان لیا ہے چھوڑ دیا ہے۔ (الانتقاء لابن عبدالبر ص۱۵۱، الخیرات الحسان ص۷۴)

ڈاکٹر علی حسن عبد القادر فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ کے مخالفین نے ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ حدیث کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے کہ بلکہ سارا کام اپنی فکر و نظر سے کیا کرتے تھے۔ اسی فکر کی خاطر انھوں نے بہت سی حدیثوں کو ٹھکرا دیا جیسا کہ ابو صالح فراء نے یوسف بن اسباط سے نقل کیا ہے کہ ابو حنیفہ نے چار سو سے زیادہ احادیث رسولؐ کی مخالفت کی ہے۔ یوسف سے سوال ہوا کہ آپ ان حدیثوں کو جانتے ہیں؟ انھوں نے کہا بیشک۔ دریافت کیا گیا کہ کوئی مثال دیجئے۔ کہنے لگے کہ پیغمبر اسلامؐ نے پیادہ مجاہد کے لئے ایک حصہ رکھا تھا اور سوار کے لئے دو۔ ابو حنیفہ نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ میں گھوڑے کو ایک مومن کا درجہ نہیں دے سکتا ہوں۔

حضورؐ نے اونٹ کو اشعار کیا (اس کے کوہان کو زخمی کر کے اس کے خون کو بدن پر مل دیا) اور ابو حنیفہ نے اسے مثلہ سے تعبیر کر کے ناجائز کر دیا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ خریدار اور بائع ایک مقام پر جمع رہنے تک معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ابو حنیفہ نے اس اختیار کو باطل کر دیا۔

حضور اکرمؐ نے سفر میں جاتے وقت عورتوں کے درمیان قرعہ ڈالا تھا اور ابو حنیفہ نے قرعہ کو قمار بازی قرار دے دیا۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ ابو حنیفہ کے دور میں چار صحابہ کرام موجود تھے اور انھوں نے کسی ایک سے بھی ملاقات کی فکر نہیں کی۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں ان مخالفتوں کی تعداد ۱۵۰ تک شمار کرائی ہے۔

(نظرۃ عامہ فی تاریخ الفقہاء الاسلامی للدکتور علی حسن عبد القادر ص۲۲۵)

خطیب بغدادی نے ان کی تمام حدیثوں کو نقل کر کے ان پر موافق و مخالف تبصرہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ان کی طرف ایسی باتوں کی نسبت دی ہے جن کی تصحیح تقریباً ناممکن ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حنفی علماء نے خطیب کی سخت مذمت کی ہے اور انھیں متعصب ٹھہراتے ہوئے ان کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ (تاریخ بغداد ۱۳ ص۴۲۳)

مختصر یہ ہے کہ ائمہ مذاہب کی تاریخ حیات کا ترتیب دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں مختلف اقوال کا ایک انبار ہے جس کے درمیان سے حقیقت کا نکال لینا ایک دشوار ترین کام ہے۔

ابوحنیفہ کی زندگی بھی ایک معمہ کی حیثیت رکھتی ہے جیساکہ استاد ابوزہرہ نے فرمایا ہے کہ ابوحنیفہ کے مریدوں نے اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ انھیں انبیاء کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔ توریت میں ان کی بشارت اور زبانِ پیغمبرؐ پر ان کی خبر ولادت تلاش کر لی ہے اور دوسری طرف ان کے دشمنوں نے انھیں کفر والحاد وغیرہ سے متہم کر کے دین و دیانت اور کتاب وسنت کا مخالف ٹھہرایا ہے۔

مناقب کی کتابیں بہت ہیں لیکن ان سے کوئی معقول نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا ہے۔ ان میں ہر روایت مبالغہ کی حامل اور ہر داستان غلو واغراق کا نمونہ ہے۔ نہ تمام باتوں کو تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہر روایت ٹھکرائی ہی جاسکتی ہے۔ ایک محقق کا فریضہ ہے کہ گہری نظر سے تنقید کر کے حق وباطل میں امتیاز کر کے صحیح کو ضعیف سے الگ کرے۔ (ابوحنیفہ ص ۵ تا ۷)

ہمارے لئے ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ہم نہ تو اقوال پر تبصرہ کرسکتے ہیں اور نہ کسی کے بیان کی تکذیب وتصدیق میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اس شخصیت کے بارے میں بزرگانِ دین اور علماء اسلام کے اقوال آپ کے سامنے رکھ دیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم نے یہ کام انجام دے دیا۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارا فیصلہ اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب ہم ان اقوال سے آگے بڑھ کر ان کی پوری زندگی پر ایک نظر ڈال لیں۔

ابوحنیفہ

نشوونما
تعلیم و تربیت
اساتذہ
تلامذہ

ابو حنیفہ

حضرت ابو حنیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ یا ۱۵۲ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

انھوں نے اموی دورِ حکومت میں ۵۲ سال گذارے اور عباسی زمانۂ خلافت میں ۱۲سال۔ ان کی نشوونما کوفہ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانہ میں ہوئی اور انھوں نے ابتدائی زندگی ہی سے حجاج کی سنگ دلی، اس کے مظالم اور اس کی بدسرشتی کا مشاہدہ کرلیا تھا۔ حجاج کے مرتے وقت ان کا سن پندرہ سال کا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مختلف شہروں کے عمال بادشاہوں کی خوشامد میں اسلامی شاہراہ سے الگ ایک راستہ بنائے ہوئے ہیں۔ رعایا پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں کوئی حاکم کوئی تکلف نہیں محسوس کرتا ہے۔ قومی تعصب بھی شباب کی منزلوں پر ہے۔ عرب و عجم کے اختلاف ہمہ گیر ہو رہے ہیں۔ عجم پر صرف اس بنا پر مصائب ٹوٹ رہے ہیں کہ وہ عرب نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک صاحبِ احساس کے دل میں ایسے نظام کی طرف سے بغاوت کا جذبہ پیدا ہونا ہی چاہیئے تھا اور اسے ہر اس تحریک میں حصہ لینا چاہئے تھا جو ایسے ظالم نظام کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اٹھائی جائے۔

ابو حنیفہ کی ابتدائی زندگی کارخانہ اور تجارت کی تھی۔ وہ کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور زندگی کے دن عیش سے گذار رہے تھے، دولت کی بھی کسی حد تک فراوانی تھی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا

کہ انھوں نے باپ کے زیر سایہ زندگی کی کتنی منزلیں طے کی ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کا ماحول اور ان کا دورِ حکومت ایسا ہی تھا کہ جس میں ایک لائق انسان نمایاں حیثیت حاصل کر سکے۔ اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنا ایک مقام پیدا کر سکے۔ ادھر کوفہ بھی ایک علمی مرکز بن رہا تھا جہاں علمی اجتماعات ہوتے تھے۔ سیاست، عقائد، مذہب ہر قسم کے موضوع پر مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اموی دور کے خاتمہ تک امت کے رجحانات اس منزل پر پہنچ گئے جہاں اس سے پہلے پہنچنا ناممکن تھا۔ کوفہ کے اجتماعات میں علم کلام، فقہ، شعر و سخن ہر ایک کا حلقۂ فکر الگ الگ تھا۔ علم کلام کے حلقۂ فکر میں قضا و قدر، کفر و ایمان اور کردارِ صحابہ پر بحث ہوتی تھی۔ ابو حنیفہ کو یہ حلقہ بحث زیادہ پسند آیا اور وہ اسی سے منسلک ہو گئے۔

(ضحی الاسلام ۲ ص۱۷۸)

کہا جاتا ہے کہ علم کلام کی بحثوں میں انھوں نے بڑا نام پیدا کر لیا تھا جس کا شاہد یہ ہے کہ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ اسی علم کلام میں گذرا ہے۔ انھوں نے ۲۰ مرتبہ مناظرہ کے سلسلے میں بصرہ کا سفر کیا اور ہر سفر میں سال دو سال قیام بھی کیا۔

"اگرچہ اس روایت میں مبالغہ کا حصہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔" (مناقب ابو حنیفہ للمکی ا ص۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کاروبار میں گذری۔ ایک مدت کے بعد انھیں شعبی نے تحصیل علم کی طرف متوجہ کیا تو حلقۂ کلام کی طرف جھک گئے۔ اور آخر کار حماد بن ابی سلیمان المتوفی ۱۲۰ھ کے شاگردوں میں داخل ہو گئے اور ان کے بعد اس حلقہ کی نمایاں شخصیت بن گئے۔ حالات نے بھی ان کا ساتھ دیا اور زمانہ بھی سازگار مل گیا۔ خود بھی خاصے ذہین و ہوشمند تھے اسی لئے کسی ایک موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

یہ مزید خوش قسمتی تھی کہ اسی دور میں اہل حدیث و اہلِ قیاس اور عرب و عجم کے جھگڑے چھڑ گئے۔ طرفین سے طعن و طنز کی یورش ہونے لگی۔ یہ بھی حماد کے حلقۂ درس کی نمایاں شخصیت ہونے کے ناطے پیش پیش رہنے لگے۔ ان کے گرد زیادہ تر عجم اور موالی تھے جن کے ساتھ حکومت کا رویہ انتہائی تشدد آمیز اور نفرت انگیز تھا۔ اس لئے کہ حماد خود بھی عرب نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں بھی حکومت کی طرف سے نفرت کی ایسی آگ بھڑک اٹھی جو ایک احساس مند دل کو جلا کر

خاک کر سکتی تھی۔

کوفہ علم کا مرکز بن چکا تھا۔ فکر و نظر کی تحریکیں عروج کی منزلوں میں تھیں۔ اہلِ رائے و اہلِ حدیث کا اختلاف کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ موالی میں یہ جذبہ بھی پیدا ہو چکا تھا کہ اب ہمیں بھی سماج میں ایک مقام بنانا چاہئے اور عربوں کے خلاف کھل کر احتجاج کرنا چاہئے۔ کوفہ میں ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ ان کے افراد حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ فوج میں ان کی نمائندگی تھی۔ اربابِ علم و فن ان کے یہاں پیدا ہو چکے تھے۔ حکومت کے ناروا طرزِ عمل نے مصائب برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا اور بقول اصفہانی "عباسی دورِ حکومت سے پہلے اگر کوئی عرب بازار سے سامان خریدتا تھا اور کسی عجمی کے سر پر لادنا چاہتا تھا تو اس عجمی کو انکار کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ ایک عجمی نے بنی سلیم کی ایک لڑکی سے عقد کر لیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن بشر نے مدینہ جا کر وہاں کے حاکم ابراہیم بن ہشام بن اسماعیل سے شکایت کر دی اور اس نے ایک شخص کو بھیج کر میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیا اور عجمی کو دو سو تازیانے الگ سے لگائے۔ اس کے جسم کے سارے بال مونڈ دیئے گئے اور اس پر محمد بن بشیر نے یہ شعر بھی کہا کہ "آپ نے سنّت و عدالت کے مطابق فیصلہ کیا ہے کیوں نہ ہو حکومت آپ کے گھر کی میراث ہے"۔

عجموں کے ساتھ یہ رویہ بھی درحقیقت معاویہ بن ابی سفیان کا ایجاد کردہ تھا۔ معاویہ کو یہ معلوم تھا کہ حضرت علیؑ کے طرزِ عمل میں مساوات و انصاف کا ایک ایسا جوہر ہے جو عجموں کو ان کی ہمدردی پر ابھار دے گا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی یہ تدبیر شروع کر دی کہ عجم کو ذلیل کر کے انھیں سر اٹھانے کے قابل نہ رکھا جائے۔

مدائنی راوی ہے کہ حضرت علیؑ کے چاہنے والوں کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور اس نے یہ درخواست دی کہ آپ مال کی تقسیم میں عرب کو عجم پر فوقیت دیں تاکہ مخالف عناصر اپنے ہاتھ میں آجائیں۔ اس لئے کہ معاویہ اس قسم کی تمام مکاریوں میں ماہر ہے —— تو آپ نے فرمایا کہ میں ظلم سے مددگار نہیں پیدا کر سکتا۔ (شرح نہج البلاغہ)

ایسے ہی حالات میں ابوحنیفہ نے آنکھیں کھولیں اور ایسے ہی ماحول میں نشو و نما پائی۔ ان کا ذاتی

تعلق بھی اسی مظلوم طبقہ سے تھا جو حکومت کی بدسلوکی سے عاجز آکر بغاوت کے جذبات کو بیدار کرچکا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی حکومت بنی امیہ سے منتقل ہوکر بنی عباس کی طرف آئی اور اس انقلاب میں عجموں نے نمایاں طور پر حصّہ لیا، ابوحنیفہ کے وقار کو چار چاند لگ گئے۔ عجموں کو اپنی حیثیت نمایاں کرنے کی فکر لاحق تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چار طرف انھیں کے نام کا شہرہ اور انھیں کا چرچا ہوگیا۔ انھوں نے بھی اپنی اسی سیاست کی بنا پر دشمنوں سے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا۔ لوگ گالیاں دیتے تھے اور وہ سن لیتے تھے۔ لوگ تنقید کرتے تھے اور وہ برداشت کر لیتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے اصحاب کی امداد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دولت و ثروت بھی دست بوسی میں مصروف تھی۔

مساور نے ان کی ہجو میں یہ اشعار کہے کہ "اب تک ہم سکون کے ساتھ مذہبی زندگی گذار رہے تھے اور اب ان قیاسیوں کے چکر میں پھنس گئے ہیں" تو ابوحنیفہ نے ان سے مل کر راضی کرنے کے لئے چند درہم دے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مساور کی زبان بدل گئی اور کہنے لگا کہ "اگر لوگ نئے قسم کا قیاس کریں گے تو ہم صحیح قیاس جو حضرت ابوحنیفہ کا ہے وہ پیش کر دیں گے، اے فقہاء قبول کریں گے اور اپنے اپنے صحیفہ میں درج کریں گے" اہلِ حدیث نے ان اشعار کا یہ جواب دیا کہ اگر کوئی صاحبِ قیاس ضعیف رائے پیش کرے گا تو ہم شریف سنّت و کتاب پیش کریں گے"

ان اشعار کو تفصیل کے ساتھ قتیبہ نے معارف ص۲۱۶ میں اور ابن عبدربہ نے العقد الفرید ص۲؍۴۱۴ میں ذکر کیا۔ لیکن ہمارا موضوع اس سے زیادہ نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ابوحنیفہ نے فقہ کے میدان میں عمر کا زیادہ حصّہ گذارنے کے بعد قدم رکھا ہے۔ بکہ میں عطاء بن رباح اور مدینہ میں نافع کی شاگردی کی اس لئے کہ یہ دونوں ہی موالی میں سے تھے۔ اس کے بعد عاصم بن ابی النجود، عطیہ عوفی، عبدالرحمٰن بن ہرمز، مولی ربیعہ بن الحارث، زیاد بن علاقہ، ہشام بن عروہ وغیرہ سے استفادہ کیا۔ لیکن جن کے ساتھ مستقل طور پر رہے اور آخر عمر تک استفادہ کرتے رہے وہ حماد بن ابی سلیمان اشعری تھے جن کے انتقال کے وقت ابوحنیفہ کا سن ۴۰ سال تھا۔ ابوحنیفہ حماد سے اپنے تعلقات کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ "میں بصرہ اس خیال سے گیا تھا کہ مجھ سے جو سوال کیا جائے گا میں اس کا جواب دے سکتا ہوں، وہاں پہنچا تو لوگوں نے ایسے سوالات کئے جن کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں نے فوراً عہد کر لیا کہ اب تاحیات حماد ہی کے ساتھ رہوں گا۔

چنانچہ ۱۸ سال تک ان کی خدمت سے استفادہ کرتا رہا"۔
حماد سے ان کے گہرے تعلقات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صرف حماد ہی کے ہو کر رہ گئے تھے بلکہ انھوں نے دیگر علماء اعلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کئی مرتبہ حج کی غرض سے مکہ و مدینہ گئے ہیں اور وہاں اہلبیتؑ کی نمایاں شخصیتوں امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ، زید بن علیؑ اور عبداللہ بن الحسن بن الحسن وغیرہ سے تحصیل علم کی ہے۔

ابو حنیفہ کی پوری فقہ کا تعلق ان کے تلامذہ اور شاگردوں سے ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں نہ مسائل لکھے تھے اور نہ کوئی فقہ مرتب کی تھی۔ اس قسم کا جتنا بھی کام ہوا ہے وہ سب ان کے شاگردوں کے ہاتھ سے انجام پایا ہے۔ ان کے شاگردوں میں بعض وہ تھے جو غیر مقامات سے سفر کر کے آتے تھے اور استفادہ کر کے چلے جاتے تھے اور بعض وہ تھے جو مستقل طور پر ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ جن کی تعداد ۳۶ تک پہنچتی ہے۔ جن میں سے ۱۸ کو وہ قابلِ قضاوت سمجھتے تھے اور ۶ کو لائق فتویٰ۔ ابو یوسف اور زفر کو قاضیوں کی تادیب کا اہل تصور کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے مذہب کی خدمت میں تمام تر ہاتھ صرف چار آدمیوں کا تھا۔ ابو یوسف، زفر، محمد بن الحسن الشیبانی، الحسن بن زیاد اللؤلوئی۔

۱۔ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری کوفہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی فقر و فاقہ میں گذاری۔ ابن ابی لیلیٰ کے بعد ابو حنیفہ کا دامن تھاما اور انھیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے بھی دس سال تک ان کے تمام اخراجات برداشت کئے۔ ابو حنیفہ اور زفر بن الہذیل کے مرنے کے بعد مذہب کی قیادت کا شرف بھی ابو یوسف ہی کو ملا اور انھوں نے حکومتِ وقت کی سرپرستی میں کافی مرجعیت پیدا کر لی اور مہدی، ہادی اور رشید تینوں کے دور میں قاضی رہے اور اسی قضاوت کے طفیل میں مذہب کو چار طرف شہرت ہوئے دی۔

ابو یوسف نے فقہ حنفی پر بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ابنِ ندیم نے کیا ہے اور وہ یہ ہیں۔ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصیام، کتاب الفرائض،

کتاب البیوع، کتاب الخراج، کتاب الوکالۃ، کتاب الوصایا، کتاب اختلاف الانصار، کتاب الرد علیٰ مالک وغیرہ۔

ابو یوسف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قیاس پر عمل کرتے ہوئے بھی حدیثوں کو اہمیت دی ہے اور اس طرح دونوں مذہبوں کو ایک کر دیا ہے۔

۲۔ محمد بن الحسن۔ بنی شیبان کے غلاموں میں سے تھے۔ ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔ ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ضرور ہوئے لیکن مکمل طور پر ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ اس لئے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کا سن صرف ۱۸ سال کا تھا۔ ابو حنیفہ کے بعد اپنے درسیات کی تکمیل ابو یوسف کے پاس کی۔ کچھ ثوری اور اوزاعی سے حاصل کیا۔ امام مالک سے حدیث کا علم سیکھا۔ تین سال ان کی خدمت میں رہے۔ قیاس میں احادیث کو جگہ دی اور فقہ حنفی کی عظیم ترین کتاب تالیف کی جس میں اکثر مسائل میں بانیٔ مذہب سے اختلاف کیا۔

۳۔ الحسن بن زیاد اللؤلوئی الکوفی المتوفیٰ ۲۰۴ھ۔ مذہب حنفی کے فقہاء میں شمار ہوتے تھے لیکن محدثین اور ارباب رجال نے ان پر کوئی اعتبار نہیں کیا ہے۔ ابن معین نے انھیں کذاب اور غیر معتبر کہا ہے۔

نضر بن شمیل نے ان کی کتابوں کو نقل کرنے والے سے کہا کہ تو اپنے شہر میں ایک شر لے آیا ہے۔

ابو ثور کا بیان ہے کہ لؤلوئی سے زیادہ جھوٹا آدمی نہیں دیکھا گیا ہے۔

ابن ابی شیبہ کا کہنا ہے کہ اسامہ اسے خبیث سے تعبیر کرتے تھے لیکن ابن قاسم نے اس کی توثیق کی ہے۔ ابو عوانہ اور حاکم نے مستخرج و مستدرک میں اس کی روایت بھی درج کی ہے۔ (لسان المیزان ۲ ص ۲۰۸)

۴۔ زفر بن الہذیل المتوفیٰ ۱۵۸ھ۔ ان کے باپ عرب تھے اور ماں ایرانی۔ یہ ابو حنیفہ کی خدمت میں ابو یوسف اور شیبانی سے پہلے پہنچے تھے اور قیاس میں سب سے بڑھے چڑھے تھے۔ ابو حنیفہ کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہنے کی وجہ سے ان کی فقہ کو مرتب نہیں کر سکے۔

لیکن بصرہ کی قضاوت کے دوران ان کے مذہب کی اشاعت میں تقریری حد تک کافی حصہ لیا۔

احمد بن معدل مالکی نے ان کی ہجو لکھی ہے۔ "اگر تیری روایت غلط ہے تو اس کی ذمہ داری ابو حنیفہ اور زفر پر ہے کہ وہ لوگ قیاس کے پیچھے روایتوں کو ترک کر دیا کرتے تھے۔ (تانیب الخطیب للکوثری ص۹۵)

محدثین نے اس کی روایتوں پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی نے زفر سے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

معاذ بن معاذ ناقل ہیں کہ میں سوار قاضی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ خادم نے آکر اطلاع دی کہ زفر دروازے پر کھڑے ہیں۔ تو سوار نے کہا کہ ہرگز اجازت نہ دینا یہ بدعتی انسان ہے۔

عقیلی نے ان کا شمار ضعفاء میں کیا ہے۔

بشر بن السری کا بیان ہے کہ میں نے سفیان ثوری کے سامنے زفر کے لئے دعائے رحمت کی تو انھوں نے منہ پھیر لیا۔

ازدی کا بیان ہے کہ زفر کا مذہب ناپسندیدہ ہے۔

احمد بن ابی العوام مناقب ابوحنیفہ میں رقمطراز ہیں کہ مجھ سے ابو جعفر طحاوی نے بیان کیا کہ میں نے ابو حازم سے ضبی کا یہ قول سنا ہے کہ زفر بصرہ میں عثمان البتی کے حلقۂ درس میں آکر مناظرہ و مباحثہ کیا کرتے تھے اور اگر کبھی شاگردوں سے تشفی نہ ہوتی تو استاد سے بحث کرتے تھے۔ استاد نے کوئی جواب دیا تو کہتے تھے کہ اس سے بہتر جواب تو ابوحنیفہ کا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ طلاب ان کی طرف کھنچنے لگے اور عثمان البتی کا حلقۂ درس سنسان ہو گیا۔

ابوحنیفہ کے یہی وہ شاگرد تھے جن کے دم سے ان کی فقہ مرتب ہوئی اور ان کے تعلیمات کی تدوین عمل میں آئی۔ اس میدان میں سب سے آگے قاضی ابو یوسف نظر آتے ہیں جن کی کتابیں فقہ کا سب سے بڑا ماخذ شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد شیبانی کا نمبر آتا ہے۔ انھوں نے چونکہ ابوحنیفہ کی شاگردی کمسنی میں اختیار کی تھی اس لئے ان کی کتابوں میں ابو یوسف کا حوالہ واضح طور پر

پایا جاتا ہے۔ ابن نجیم کا کہنا ہے کہ شیبانی کی جتنی کتابیں صغیر کے نام سے ہیں، سب میں ابویوسف کا ہاتھ ہے اور جتنی کتابیں کبیر کے عنوان سے ہیں وہ سب ان کی ذاتی تالیف ہیں۔

ابویوسف اور شیبانی اگرچہ ابوحنیفہ کے شاگرد اور انھیں کے مسلک کے پیرو تھے لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے افکار میں ان کی تقلید نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ شاگردی کے اصول اور ہوتے ہیں اور افکار و آراء میں تقلید کے قوانین اور۔ شاگردی ہی سے تقلید کا عنوان پیدا ہو سکتا تو خود ابوحنیفہ کا اجتہاد بھی ختم ہو جاتا اور وہ بھی حماد بن ابی سلیمان کے مقلدین میں شمار ہو جاتے۔ ان حضرات نے اگر اپنے استاد کی موافقت کی ہے تو صرف اس لئے کہ ان کی ذاتی فکر بھی اسی نتیجہ کی مقتضی تھی اور اگر مخالفت کی ہے تو بھی اسی لئے کہ انسان اپنی فکر میں آزاد ہوتا ہے۔ اسے دوسرے کی بلا سبب پابندی زیب نہیں دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حنفی فقہ کی کتابوں میں چاروں علماء کے اقوال نظر آتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ایک ہی مسئلہ میں ابوحنیفہ، ابویوسف، شیبانی، زفر کے اقوال الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ (ابوحنیفہ محمد ابوزہرہ، ضحی الاسلام احمد امین)

علامہ خضری کا کہنا ہے کہ بعض لوگ علماء حنفیہ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور باہمی اختلاف کو انھیں کی رائے کا تغیر و تبدل قرار دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ علماء مذہب کی تاریخ سے غفلت کا واضح ثبوت ہے اس لئے کہ ابویوسف نے کتاب الخراج میں ابوحنیفہ کی رائے لکھ کر ان کی مخالفت کی ہے اور پھر اختلاف کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ یہی انداز ان کی کتاب "خلاف ابوحنیفہ" میں ہے کہ جہاں ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کے قول کو نقل کر کے ابن ابی لیلیٰ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔

شیبانی بھی اپنی تصانیف میں ابوحنیفہ سے کھلم کھلا اختلاف کرتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر اسے علماء کی رائے کا تغیر تسلیم کر لیا جائے تو خود ان کی منسوخ شدہ رائے کو مذہب سے خارج ہو جانا چاہئے جب کہ ایسے اقدام پر کوئی حنفی مسلمان تیار نہیں ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی بات ہے کہ ابویوسف اور شیبانی نے اہل حجاز کی حدیثوں کو دیکھنے کے بعد امام ابوحنیفہ کے بہت سے فتووں سے اختلاف کیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے امام

کے مقلد نہ تھے بلکہ مستقل طور پر مجتہد تھے۔ اب چاہے ان کی رائے اپنے امام کے موافق ہو یا مخالف ورنہ اگر اس کا نام بھی تقلید پڑ جائے گا تو شافعی مذہب کوئی مذہب ہی نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ شافعی امام مالک کے شاگرد تھے۔ (الخضری تاریخ التشریع الاسلامی ص۲۲۵)

ہم آگے چل کر ان مسائل کی بھی نشاندہی کریں گے جہاں شاگردوں نے اپنے استاد سے کھل کر اختلاف کیا ہے اور ان کی کتابوں کو ان کے حسب ذیل تلامذہ نے نقل کیا ہے :-

۱۔ ابراہیم بن رستم مروزی المتوفی ۲۱۱ھ۔ انھوں نے شیبانی سے علم حاصل کیا، مالک سے روایتیں سنیں اور اپنے استاد سے نقل کر کے کتاب النوادر مرتب کی۔ (یہ یاد رہے کہ مروزی مرو ایران کے رہنے والے تھے۔ مرو، عراق کے نہیں۔ مرو سے مروزی اس لئے بنایا گیا ہے کہ عراق و ایران کا تفرقہ برقرار رہے۔)

۲۔ احمد بن حفص الکبیر البخاری : انھوں نے شیبانی سے فقہ حاصل کی، ان کی کتابوں کی روایت کی اور خود اپنے ذاتی افکار بھی قائم کئے جن میں تمام علماء سے اختلاف کیا۔ الفوائد البہیہ ۹

۳۔ بشر بن غیاث المریسی المتوفی ۲۱۸ھ : انھوں نے چند روز ابوحنیفہ سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد ابویوسف سے استفادہ کیا اور انھیں کے مخصوص اصحاب میں شمار ہو گئے۔ ابویوسف ہی سے روایت کی اور انھیں کی اتنی شدید مخالفت کی کہ انھوں نے ان کی مذمت کرنا شروع کر دی۔ محدثین نے بھی انھیں درجۂ اعتبار سے گرا دیا اور ذہبی نے انھیں ناقابل روایت قرار دے دیا۔
(لسان المیزان ۲ ۲۹)

۴۔ بشر بن الولید بن خالد الکندی القاضی المتوفی ۲۳۸ھ : یہ ابویوسف کے شاگرد تھے۔ انھیں کی کتابوں کی روایت کی اور معتصم کے دور میں بغداد کے قاضی بنے۔ اکثر بیانات میں شیبانی پر حملے کرتے تھے۔

دارقطنی نے ان کی توثیق کی ہے۔

صالح بن محمد کا کہنا ہے کہ یہ صادق تھے لیکن بیوقوف بھی تھے۔

(الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ)

۵۔ محمد بن الشجاع الثلجی المتوفی ۲۶۷ھ : حسن بن زیاد اور حسن بن ابی مالک سے علم فقہ سیکھا

اور کتاب تصحیح الآثار، کتاب النوادر، کتاب المضاربہ، کتاب الرد علی المشبہ کی تالیف بھی کی لیکن اہلِ حدیث کی نظر میں ضعیف کے ضعیف ہی رہے۔ (الفوائد البہیہ صـ۱۷۱)

۶۔ ابو سلیمان موسیٰ بن سلیمان الجوزجانی: شیبانی سے علم حاصل کیا۔ مسائلِ اصول میں کتاب تالیف کی، مامون نے قضاوت کی درخواست کی لیکن اسے ٹھکرا دیا۔ السیر الصغیر اور کتاب النوادر وغیرہ کے نام سے کتابیں بھی تصنیف کیں۔

۷۔ محمد بن سماعہ التیمی: لیث، ابو یوسف، شیبانی سے روایت کی ہے اور ابو یوسف و شیبانی کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ حسن بن زیاد کی بھی شاگردی کی ہے۔ ابو یوسف اور شیبانی کے بیان سے کتاب النوادر مرتب کی ہے۔ یہ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۳ھ میں رحلت فرما گئے۔ ابو یوسف کے صاحبزادے یوسف کے انتقال کے بعد ۱۹۲ھ میں قضاوت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی کتابوں کے نام ادب القاضی، کتاب المحاضرات، السجلات، النوادر وغیرہ ہیں۔

۸۔ ہلال بن یحییٰ بن مسلم: انھوں نے ابو یوسف اور زفر سے فقہ حاصل کی۔ شروط و احکام وقف میں کتابیں تالیف کیں اور ۲۴۵ھ میں رحلت فرما گئے۔

۹۔ احمد بن عمر بن مہیر الخصاف المتوفیٰ ۲۶۱ھ: حسن بن زیاد سے اپنے باپ کے ذریعہ علم حاصل کیا۔ مذہب پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ مہتدی کے لئے کتاب الخراج تالیف کی اور اس کے علاوہ کتاب الوصایا، کتاب الشروط الصغیر والکبیر، کتاب الادب القاضی، کتاب الحیل الشرعیہ کے نام سے کتابیں لکھیں۔

۱۰۔ ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی طحاوی المتوفیٰ ۳۲۱ھ: عبد العزیز دہلوی کا بیان ہے کہ یہ باقاعدہ مقلد نہیں تھے بلکہ ابو حنیفہ کی مخالفت بھی کیا کرتے تھے، اپنی رائے میں آزاد تھے اور دلائل کے پابند۔

محمد بن عبد الحئی کا کہنا ہے کہ ان کا شمار ابو یوسف اور شیبانی کے طبقہ میں ہونا چاہئے۔ انھوں نے امام مذہب سے اختلاف نظر بھی کیا ہے۔ اور درحقیقت یہ ایک مجتہد تھے جو ایک امام مذہب کی طرف منسوب ہو گئے ہیں۔ ورنہ انھوں نے ابو حنیفہ کی تقلید نہ اصول میں کی ہے اور نہ فروع میں۔ (الفوائد البہیہ صـ۳۱)

بعد میں آنے والی نسل نے بھی اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی اور پوری کتاب کو حنفی فقہ کا ماخذ بنا دیا۔ باوجودیکہ اس میں غیر حنفی فقہ کا بھی معقول مواد موجود تھا۔ یہ بہت بڑی ناانصافی تھی کہ ایک ابوحنیفہ کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے ان کے تمام اصحاب، تلامذہ اور عراق کے جملہ فقہاء کے ارشادات کو ان کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔" (ابوحنیفہ، محمد ابوزہرہ)

مختصر یہ ہے کہ حنفی مذہب کی تشکیل میں اتنے ہاتھ لگ گئے ہیں کہ اس کا دوسرے مذاہب کے ساتھ موازنہ تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اب فقط ایک صورت یہ رہ گئی ہے کہ حنفی مذہب کے تمام علماء و اصحاب اور فقہاء عراق کے تمام افکار و آراء کو ایک طرف رکھ کر دیگر مذاہب کے ایک ایک عالم سے مقابلہ کیا جائے جو انتہائی غیر معقول بات ہے۔ مذہبی تقابل کے میدان میں حنفی مذہب کا نام صرف اسی عنوان سے آسکتا ہے کہ ایک ایک مسئلہ میں ان کی رائے کو دیگر مذاہب سے ملا کر دیکھا جائے اور پھر حقیقت کا فیصلہ کیا جائے جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

ابو حنیفہ اور امام صادقؑ

تاریخ بتاتی ہے کہ ابو حنیفہ کا دور مباحثوں اور مناظروں سے معمور تھا۔ کہیں اسلام والحاد میں مباحثہ، کہیں فقہی مکاتب میں مناظرہ اور کہیں کسی اور رنگ کی بحث۔

ابو حنیفہ اپنی فطری صلاحیت کے اعتبار سے اس میدان کے شہسوار تھے۔ انھیں طرزِ استدلال پر اتنا عبور تھا کہ رائی کو پہاڑ اور بقول امام مالک مٹی کو سونا بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو اس ماحول سے بے حد فائدہ اٹھانا چاہئے تھا جب کہ حکومتِ وقت کی نظریں اسی پر جمی رہی ہوں اور منصور بھی اسے احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔

ابو حنیفہ کے مناظرانہ کمال کی شہرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب منصور نے یہ طے کر لیا کہ امام جعفر صادقؑ کی بڑھتی ہوئی شہرت اور ان کے علمی چرچے کو حکومت کے زور پر نہیں دبایا جا سکتا تو وہ ابو حنیفہ کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ امام کے مقابلہ میں مکہ و مدینہ اور کوفہ و قم میں ایسے علمی حلقے قائم کر دیئے جائیں جو امام کی مرجعیت کو توڑ دیں اور ان کی طرف سے لوگوں کے رخ موڑ دیں۔

اس سلسلے میں اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ امام کو مدینہ سے کوفہ طلب کیا اور ابو حنیفہ کو بلا کر یہ فرمائش کی کہ ان کے لئے سخت ترین مسائل تیار کریں تاکہ وہ ان مسائل کے جواب سے عاجز رہیں اور حکومت کا واقعی منشا پورا ہو جائے۔ اس واقعہ کو خود ابو حنیفہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ "میں نے

منصور کے حکم سے چالیس مسائل تیار کئے۔ اس کے بعد منصور نے مجھے حیرہ بلا بھیجا۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھا کہ امام جعفر صادقؑ منصور کے پہلو میں تشریف فرما ہیں۔ مجھ پر منصور کی ہیبت کا وہ اثر نہ ہو سکا جو امامت کے رعب و جلال کا ہوا۔ میں گھبرا گیا اور امام کا اشارہ پا کر بیٹھ گیا منصور نے امامؑ کی طرف رخ کر کے کہا کہ یہ ابو حنیفہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں واقف ہوں۔ اس کے بعد منصور نے کہا کہ اپنے مسائل پیش کرو۔ میں نے مسائل پیش کرنا شروع کئے اور امام جواب دینے میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا طرز جواب یہ تھا کہ اس مسئلہ میں مدینہ والوں کی یہ رائے ہے۔ تم لوگوں کا یہ خیال ہے اور میرا یہ فتویٰ ہے۔ میں نے اسی طرح سے چالیس سوال کر ڈالے اور آپ سب کے بالتفصیل جوابات دیتے رہے اور ہماری روایتوں میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ سب سے بڑا عالم وہ ہے جو اختلاف پر زیادہ نظر رکھتا ہو۔ اس بنا پر امام صادقؑ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہو سکتا ہے۔"

امام علیہ السلام کا یہ دستور تھا کہ آپ ابو حنیفہ کو برابر قیاس سے منع فرماتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قیاس ابلیس کی ایجاد ہے۔ اس سے پرہیز کرو۔ (الطبقات الکبریٰ للشعرانی ۱؍۲۸ ، حلیۃ الاولیاء ۱۹۳؍۲)

ایک مرتبہ آپ نے ابو حنیفہ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں ہرن کے آگے کے چاروں دانت توڑ ڈالے تو کیا کفارہ ہوگا؟

انھوں نے عرض کیا۔ یا ابنِ رسولؐ اللہ میں اس مسئلہ سے واقف نہیں ہوں۔

آپ نے فرمایا کہ افسوس! تم تو بڑے پالاک بنتے ہو اور تمھیں یہ خبر نہیں ہے کہ ہرن کے ایسے دانت ہی نہیں ہوتے ہیں۔

ابو نعیم کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ، عبداللہ بن ابی شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ یہ تینوں اشخاص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ابن لیلیٰ سے پوچھا کہ یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟

انھوں نے عرض کی کہ امورِ دین کا بہت بڑا بابصیرت عالم!

آپ نے فرمایا شاید یہی امورِ دین میں قیاس کرتے ہیں۔

انھوں نے عرض کیا، جی ہاں!

آپ نے فرمایا تمھارا نام کیا ہے؟

ابوحنیفہ نے جواب دیا، نعمان!
آپ نے فرمایا تم کچھ نہیں جانتے ہو۔ اور یہ کہہ کر آپ نے سوالات شروع کر دیئے۔ ابوحنیفہ کسی ایک کا جواب نہ دے سکے تو حضرت نے فرمایا۔ اے نعمان میرے پدر بزرگوار نے بسلسلۂ عصمت، رسول اکرمؐ سے یہ روایت کی ہے کہ سب سے پہلے امرِ دین میں ابلیس نے قیاس کیا تھا۔ اللہ نے سجدہ کا حکم دیا اور وہ آگ، مٹی کے موازنہ میں لگ گیا ـــــ یاد رکھو جو شخص قیاس کرے گا وہ قیامت کے دن ابلیس کے ساتھ محشور ہوگا۔
ابن شبرمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت نے یہ مسائل پوچھے۔ اے ابوحنیفہ قتل بڑا گناہ ہے یا زنا؛
ابوحنیفہ نے جواب دیا قتل!
فرمایا، پھر قتل میں دو گواہ کیوں کافی ہیں اور زنا میں چار کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟
اے نعمان، یہ بتاؤ کہ نماز زیادہ اہم ہے یا روزہ؟
ابوحنیفہ نے عرض کیا، نماز!
فرمایا، پھر عورت پر حالتِ حیض کے روزوں کی قضا کیوں واجب ہے اور نماز کی قضا کیوں نہیں ہے؟
ابوحنیفہ نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ تمھارا قیاس ہے جو کہیں بھی کام نہیں آتا ہے۔
(حلیۃ الاولیاء ۳ ۱۹۷)
تاریخ نے نہ جانے کتنے ایسے مواقع محفوظ کئے ہیں جہاں ابوحنیفہ کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا ہے اس لئے کہ وہ اپنی صلاحیت واستعداد سے بھی باخبر تھے اور امام کی معرفت بھی رکھتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا مقصد مسلمانوں کو صحیح راستہ پر لگانا ہے اور ان کا گھر علماء و حکماء کا مدرسہ ہے جہاں دور دراز کے لوگ اپنی علمی تشنگی کو دور کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور اپنے مشکلات حل کراتے ہیں۔ ان کا قول فیصلہ کن اور ان کا جواب دندان شکن ہوتا ہے۔ یہ جب بھی کوفہ آجاتے ہیں تو سب بارگاہیں سنسان ہو جاتی ہیں اور طالبانِ فضل وکمال موقع کو غنیمت جان کر ان کے گرد ہجوم کر لیتے ہیں۔
ابوحنیفہ کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ اکثر اوقات امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں آکر نہایت

ادب و احترام کے ساتھ آپ سے علمی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ اور گفتگو میں ہمیشہ جعلت فداک (قربان شما) کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ انھوں نے امام سے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ جنھیں ان کی حدیثیں جمع کرنے والوں نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے اور ابو یوسف نے کتاب الآثار میں درج کیا ہے۔

ابو حنیفہ کا اہلبیتؑ کی طرف رجحان و میلان ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے تاریخی اعتبار سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اکثر مواقع پر اس خانوادہ کا ساتھ دیا ہے۔ زید بن علیؑ کے انقلاب میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ زید کے ساتھ خروج کو جنگ بدر میں رسول اللہ کے ساتھ جہاد کے برابر سمجھتے تھے۔

ان سے پوچھا گیا کہ زید کے جہاد میں آپ نے کیوں شرکت نہیں کی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس کچھ امانتیں رکھی ہوئی تھیں جنھیں ابن ابی لیلی نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے میں مجبور ہو گیا۔ (ابو حنیفہ محمد ابو زہرہ ص۶۷، مناقب ابی حنیفہ للبزازی ۱ ص۵۵)

محمد بن عبد اللہ بن الحسن اور ان کے بھائی ابراہیم کے جہاد میں بھی ان کی مدد شامل تھی اور وہ لوگوں کو ان کی ہمراہی پر ابھار رہے تھے۔ (مناقب ابی حنیفہ للمکی ۲ ص۸۴)

ایک عورت نے ان کے پاس آکر اپنے بیٹے کی شکایت کی کہ اس کا رجحان ابراہیم کی طرف ہے اور وہ میرے منع کرنے پر بھی نہیں مانتا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ تو منع ہی کیوں کرتی ہے؟ (مناقب ابی حنیفہ مکی ۲ ص۸۴)

ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں نے ابی حنیفہ سے یہ شکایت کی کہ تم نے ابراہیم کے ساتھ خروج کا حکم کیوں دے دیا۔ میرا بھائی اس سلسلہ میں بلاوجہ کام آگیا۔ تو انھوں نے فرمایا کہ ابراہیم کے ساتھ شہادت زندگی سے بہتر ہے۔ تمھارے بھائی کو شہدائے بدر کا مرتبہ مل گیا ہے۔ (مقاتل الطالبیین ص۲۲۶) اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابو اسحٰق نے ابو حنیفہ سے اظہار نفرت شروع کر دیا۔

ابو حنیفہ نے ابراہیم کو ایک خفیہ خط بھی لکھا کہ آپ کوفہ کا ارادہ کریں۔ یہاں زیدی حضرات آپ کی کمک کریں گے۔ یہ لوگ خود ہی اس فکر میں ہیں کہ ایک دن ابو جعفر کی گردن کاٹ کر آپ کے پاس پیش کر دیں۔ یہی سبب ہوا کہ مرجیہ نے ابو حنیفہ کی مخالفت شروع کر دی۔ (مقاتل الطالبیین ص۲۲۶)

ابو حنیفہ کے سامنے جب بھی محمد بن عبداللہ بن الحسنؑ کا ذکر آتا تھا ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ (مناقب کردری ۲ ۲۲)

یہی وہ حالات تھے جن کی بنا پر بعض لوگوں نے ابو حنیفہ کو زیدی شیعہ تک کہہ دیا ہے۔ چنانچہ محمد ابو زہرہ اپنی بحث کے خاتمہ پر فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ اپنے افکار و رجحانات کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ انھوں نے خلافت کو اولاد فاطمہؑ کا حق سمجھا۔ اور حکومت وقت کو ہمیشہ غاصب سمجھتے رہے۔ (ابو حنیفہ ص۱۹۵)

ان کا خیال تھا کہ جنگ جمل وغیرہ میں حق حضرت علیؑ کے ساتھ تھا۔ اور مقابل سب باطل پر تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان سے جنگ جمل کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ "حضرت علیؑ نے انصاف سے کام لیا تھا اور انھوں نے لوگوں کو باغیوں سے جہاد کا سلیقہ سکھایا تھا۔ (مناقب ملکی ۲ ۲۴)

"جس نے علیؑ سے جنگ کی وہ باطل پر رہا اور علیؑ حق پر رہے"۔

"علیؑ نے طلحہ و زبیر سے اس لئے جنگ کی کہ ان لوگوں نے بیعت کے بعد بھی مخالفت کی تھی"۔

"اہل شام صرف اس لئے میری مخالفت کرتے ہیں کہ میں علیؑ کا طرفدار اور معاویہ کا دشمن ہوں"۔

"اہلِ حدیث مجھ سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ میں محب اہل بیتؑ ہوں۔ ان کے فضائل کا اعتراف کرتا ہوں اور حضرت علیؑ کی خلافت کا قائل ہوں"۔

اس قسم کے بے شمار واقعات اور بیانات تاریخ کے اوراق میں موجود ہیں لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ وہ شیعہ تھے یا غیر شیعہ۔ یہ بات میرے موضوع سے خارج ہے۔

مجھے اس وقت صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ منصور کا انھیں زہر دلانا کس بنیاد پر تھا۔ اس کا سبب بھی خانوادہ رسالت کی امداد ہی تھا۔ یا اس کی پشت پر قضاوت سے انکار کام کر رہا تھا۔

مورخین نے اس مقام پر کافی اختلاف کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا سبب صرف قضاوت سے انکار تھا اور بس۔

بات صرف یہ تھی کہ منصور نے انھیں کوفہ سے بغداد بلا کر ان سے قضاوت کے لئے کہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ اس نے گرفتار کر لیا اور وہ زندان ہی میں راہی عدم ہو گئے۔ اس قصہ میں بھی بعض حضرات نے

قضاوت کا سرے سے انکار کیا ہے اور بعض کا بیان ہے کہ مجبوراً قضاوت قبول کر لی تھی لیکن اسی صدمہ میں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ (مناقب ابو حنیفہ بزازی)

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ چونکہ ان پر ابراہیم کے شیعوں میں محبوب ہونے کی تہمت تھی اور انھوں نے ان کے ساتھ خروج کے واجب ہونے کا فتویٰ دیا تھا اس لئے منصور نے انھیں کوفہ سے طلب کیا تھا۔

ابوالفرج اصفہانی نے عبداللہ بن ادریس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ابو حنیفہ سے دو آدمیوں نے محمد اور ابراہیم کے ساتھ خروج کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے اس خروج کو لازم قرار دیا اور ابراہیم کو خفیہ خط لکھا کہ آپ کوفہ کی طرف آئیے۔ یہاں آپ کے شیعہ ابو جعفر منصور کی تاک میں لگے ہیں۔ آپ کی سرپرستی میں یہ اس کا کام تمام کر دیں گے ـــــ منصور کو اس خط کی اطلاع مل گئی اور اس نے انھیں زہر دے کر ان کا کام تمام کر دیا۔ (مقاتل الطالبین ص۲۷۴)

ابوالفرج کے اس بیان پر اس لئے اعتماد نہیں ہو سکتا ہے کہ ابراہیم کا قتل ۱۴۵ھ میں واقع ہوا ہے اور ابو حنیفہ کا انتقال ۱۵۰ھ۔ اب نہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ خط پکڑے جانے تک منصور پانچ سال تک ابو حنیفہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا جب کہ قتل و غارت اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ ابو مسلم جیسے بڑے بڑے لوگوں کا خاتمہ کرا چکا تھا اور نہ کوئی ایسا زہر ہی فرض ہو سکتا ہے جس کا اثر اتنی دیر کے بعد ظاہر ہو۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ منصور کو اس خط کی اطلاع اتنے عرصہ کے بعد ہوئی ہو اور اس نے اطلاع کے بعد ابو حنیفہ کے قتل کا اقدام کیا ہو۔

ابو حنیفہ ہی کی طرح محمد اور ابراہیم کے ساتھ مالک بن انس، اعمش، مسعر بن کدام، عبادہ بن عوام، عمران بن داؤد قطان اور شعبہ بن الحجاج وغیرہ کی رائے بھی تھی۔ ان میں بعض حضرات ان کے لشکر کے سپاہی بھی رہ چکے تھے۔ اور ان کے ساتھ شہادت کو جنگ بدر کی شہادت کے ہم پلہ تصور کرتے ہوئے ان کے معرکہ کو بدر صغریٰ سے تعبیر کر رہے تھے منصور نے ان فقہاء کو صرف اس لئے نظرانداز کر دیا تھا کہ اسے ایسے بے شمار فقہاء کی ضرورت بھی تھی جن کا اجتماع و اشتہار امام جعفر صادقؑ کی شخصیت اور مرجعیت کو متاثر کر سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابو حنیفہ مالک کی طرح سست آدمی نہ تھے۔ مالک نے پہلے محمد کے

سناتھ خروج پر زور دیا لیکن جب منصور نے ان پر عتاب نازل کیا تو اس کے ہم خیال ہو گئے اور یہاں تک کہنے پر آمادہ ہو گئے کہ حضرت علیؑ کو کسی صحابی پر تقدم حاصل نہیں ہے ــــ لیکن ابو حنیفہ اپنی رائے پر آخر وقت تک ثابت قدم رہے۔ مصائب و مظالم نے ان کے موقف میں کوئی تغیر نہیں پیدا کیا۔ وہ حضرت علیؑ کو تمام صحابہ یا کم از کم حضرت عثمان سے بہتر سمجھتے تھے اور حکومتِ وقت کو علی الاعلان ناجائز قرار دیتے تھے جو آخر دم تک کرتے رہے۔

ابو حنیفہ کے سانحۂ قتل کا کوئی سبب بھی بیان کیا جائے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس حادثہ کا بنیادی محرک ان کا حکومت وقت کے خلاف صریحی اعلان تھا جس نے انھیں منصور کی نظروں پر چڑھا دیا اور اس نے ان کا کام تمام کرا کے دم لیا۔

ابو حنیفہ کا علمائے شیعہ سے ارتباط و تعلق بھی قابلِ تشکیک و انکار نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابو عصمہ نے اس سلسلے میں یہ داستان وضع کر دی ہے کہ ان سے راویوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہر راوی کی روایتیں لے لو سوائے شیعوں کے کہ ان کا مسلک اصحابِ رسولؐ کی توہین و تذلیل ہے اور ان سے روایت کرنا ناجائز ہے۔

اس روایت میں پہلی کمزوری یہ ہے کہ اس کا راوی نوح بن مریم مروزی متوفی ۱۷۳ھ ہے جو اپنے جعلساز ہونے میں شہرۂ آفاق تھا۔

حافظ زین الدین عراقی نے اس کے حالات میں نقل کیا ہے کہ اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ تم نے فضائل قرآن کے بارے میں عکرمہ سے اتنی روایتیں کیوں کر بیان کر دیں تو اس نے جواب دیا کہ لوگ قرآن سے غافل ہو رہے تھے اس لئے میں نے بر بنائے ضرورت یہ حدیثیں وضع کر دی ہیں تاکہ فقہ ابو حنیفہ اور مغازی محمد بن اسحاق کے بجائے قرآن ہی پڑھا جائے۔

بخاری نے اسے معلی بن ہلال کے درجہ کا جعلساز قرار دیا ہے۔ (شرح الفیہ عراقی ۱ ص ۱۶۸، الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۲۲۱)

ابن حجر نے اس کی تکذیب کو اجماعی قرار دیا ہے۔ (لسان المیزان ۶ ص ۱۶۸)

ابو عصمہ کا مقصد اس روایت سے صرف یہ تھا کہ امام ابو حنیفہ کے ماننے والوں کے ذہن میں شیعوں کی طرف سے یہ غلط فہمی پیدا کر دی جائے کہ وہ صحابۂ کرام کی توہین و تذلیل کرتے ہیں اور ان کے کسی احترام

کے قائل نہیں ہیں جو اس تحقیق و تفتیش کے دور میں کسی طرح بھی قابلِ توجہ نہیں ہو سکتی ہے۔

ابو عصمہ کے اس بیان میں دوسری کمزوری یہ ہے کہ ابو حنیفہ خود بھی شیعوں سے روایت کرتے تھے۔ ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ شیعوں سے روایت کرنے کو حرام کرسکیں اس لئے کہ یہ بات ان کے کردار کی خامی کی اعلیٰ ترین دلیل ہوتی۔ ابو حنیفہ کی کتابیں "کتاب الآثار"، "کتاب الخراج"، "کتاب الرد علی الاوزاعی" شیعہ علماء کے روایات سے بھری ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

جابر بن یزید بن حارث جعفی المتوفی ۱۲۸ھ، حبیب بن ثابت کوفی متوفی ۱۱۹ھ مخول بن ابی راشد نہدی متوفی ۱۴۱ھ، سلمہ بن کہیل حضرمی ۱۱۳ھ، اجلح کندی ۱۴۵ھ، اسماعیل بن عبدالرحمٰن کوفی ۱۲۷ھ منہال بن عمر کوفی اسدی بن ثابت کوفی ۱۱۶ھ، زبید بن الحارث کوفی ۱۲۲ھ۔

ابو حنیفہ کی علماء شیعہ اور ائمہ اہلبیتؑ کی شاگردی سے انکار تاریخ کی واضح حقیقت کو جھٹلانے کے مرادف ہے۔ جو حق و انصاف کی بارگاہ میں کسی طرح قابلِ معافی نہیں ہو سکتا ہے۔

خلاصۂ بحث

(۱)

عام طور پر اظہارِ حقیقت طبیعتوں پر صرف اس لئے گراں گذرتا ہے کہ عوامی مزاج اندھی تقلید اور ناروا تعصب کا شکار رہتا ہے۔ اس میں حقیقت کے برداشت کرنے کی سکت اور صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ پھر مذاہب کے سلسلے کی بحث بھی ایک ایسی گفتگو ہے جس میں ناخوشگوار باتوں کا درمیان میں آجانا ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ حقیقت کی راہیں پیچیدہ اور ان کی رکاوٹیں بے شمار ہوتی ہیں۔ قدم قدم پر بغض و عناد کے امکانات اور ہر لمحہ اختلاف کی بھیانک تصویریں سامنے آتی ہیں مسلمانوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے جو باہمی تعصب و اختلاف ہی کو روحِ مذہب سمجھے ہوئے ہے۔ اس میں بغض و عناد ہی جان تہذیب بنا ہوا ہے۔ یہاں ہر شخص اپنے مذہب کی تائید میں روایتیں وضع کرنے اور دوسرے کے مذہب پر غلط تنقید کرنے ہی کو اہم فریضہ تصور کرتا ہے۔

مسلمانوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ زحمت نہیں کی کہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے اختلافات کی اصلیت اور ان کے دور کرنے کے وسائل پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ہم میں ایک دوسرے سے عداوت کا بنیادی جذبہ کیسے پیدا ہو گیا؟ ہمارا ضمیر اختلاف کیوں کر بن گیا۔ ہمیں ہوا و ہوس، جذبات و احساسات کی گونج میں صدائے اتحاد کا شعور کیوں نہیں ہوتا؟ بلکہ ان ناخوشگوار حالات کو کچھ ایسے افراد بھی مل گئے جنھوں نے اختلافات کی خلیج کو وسیع تر بنانے ہی کو ایک مقدس فریضہ تصور کیا اور اسی کو سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے یا اقتدار کی پیاس بجھانے کا بہترین وسیلہ قرار دیا۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ

امت کا اتحاد ہماری راہوں میں رکاوٹ پیدا کرے گا اور ہمارے اقتدار کو ہمہ گیر نہ ہونے دے گا اس لئے انھوں نے اس رکاوٹ کو دور کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور اس طرح اسلامی معاشرہ ان تمام مشکلات کا شکار ہو گیا جن کے نتائج آج ہمارے پیش نظر ہیں۔

۲

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حکامِ جور نے اپنی حکومتوں کا سارا زور اس ایک بات پر صرف کر دیا تھا کہ دنیا کو آلِ محمدؑ سے منحرف کر کے عوامی ذہنوں میں ایسے احساسات پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ ان حضرات کی طرف رخ بھی نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس منحوس سیاست کا نتیجہ یہ تھا کہ شیعہ، حکومت کی نظروں میں سما نہ سکے اور انھیں تمام مصائب و آلام کا شکار ہونا پڑا۔

شیعہ، آلِ رسولِ پاک کو اولی الامر، حاملِ روحِ اسلام، داعیانِ شریعت، نمونۂ قدس و طہارت اور دینِ الٰہی کا ابلتا ہوا چشمۂ ہدایت سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں آلِ رسولؐ کا اتباع لازم اور ان سے انحراف حرام تھا۔ وہ مصائب برداشت کر سکتے تھے لیکن آلِ محمدؐ کا دامن نہ چھوڑ سکتے تھے۔ مظالم کا سامنا کر سکتے تھے لیکن ان سے منہ نہ موڑ سکتے تھے۔

حکومتِ وقت نے دیکھا کہ ان فدایانِ آلِ محمدؐ کو رعب و داب، ظلم و ستم اور جور و جفا کے زور پر نہیں دبایا جا سکتا ہے چنانچہ اس نے ان کی آواز کو دبانے کے لئے ایک نئی راہ نکالی اور قدم قدم پر تہمتوں کے انبار لگنے لگے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ یہ تمام تہمتیں حقیقت سے بیگانہ اور انصاف سے بعید ہیں لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کا کوئی اور وسیلہ بھی نہیں ہے۔ جب تک اس قوم کی آواز میں زور رہے گا ہمارا اقتدار پروان نہیں چڑھ سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے استحکام کے سلسلے میں ہر امکانی قدم اٹھایا اور شیعوں کی مخالفت کا کوئی ایک دقیقہ بھی اٹھا نہیں رکھا۔

حد ہو گئی کہ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں صاف صاف لکھ دیا کہ اکثر فقہاء نے بعض مستحبات کو ترک کر دینے ہی کو بہتر قرار دیا ہے کہ رافضیوں نے ان مستحبات کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ اب اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو ان سے مشابہت پیدا ہو جائے گی اور سنّی و رافضی میں امتیاز نہ رہ جائے گا۔ حالانکہ یہ امتیاز رافضیوں سے قطع تعلق کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ان سے قطع تعلق کی مصلحت سنّت کی مصلحت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

ہدایہ کے مصنف رقمطراز ہیں کہ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہننا مستحب ہے لیکن ہم بائیں ہاتھ میں صرف اس لئے پہنتے ہیں کہ اسے رافضیوں نے اپنا شعار بنالیا ہے۔

حضرت غزالی فرماتے ہیں کہ قبروں کا مسطح بنانا مطابق شریعت تھا لیکن چونکہ یہ رافضیوں کا شعار بن بن گیا ہے اس لئے ہم کوہان نما بناتے ہیں۔ (الغدیر ۱۰ ۲۱۰)

شیخ محمد عبدالرحمٰن اپنی کتاب رحمۃ الامہ فی اختلاف الائمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مذہب شافعی کی بنا پر قبروں کا مسطح ہونا ہی مطابق شرع اور افضل ہے لیکن ابوحنیفہ اور احمد نے اس کی مخالفت کی ہے کہ یہ رافضیوں کا شعار بن چکا ہے۔ (حاشیہ میزان شعرانی ۱ ۸۸)

(۳)

شیعوں کے سامنے یہ تمام مصائب و آلام صرف اس لئے آئے کہ وہ آل محمدؐ کے پیرو اور ان کے طرفدار تھے۔ وہ کسی بھی قیمت پر ان کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کرسکتے تھے۔ انھوں نے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر کے امت کا ساتھ دے دیا ہوتا تو انھیں ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ حکومت کی پالیسی آل محمدؐ کو مٹا دینے سے ہم آہنگ ہے۔ اب اپنے مصائب سے گھبرا کر اس کا ساتھ دے دینا آلِ رسولؐ کی تباہی میں حصّہ لینے کے مرادف ہے جو کسی طرح بھی روا نہیں ہوسکتا ہے۔

حکومت نے شیعوں کو اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مصر میں بنی ایوب کے بادشاہوں نے روز عاشور کو صرف اس لئے روز مسرت بنالیا کہ شیعہ اس دن کو قیامت سے کم نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ فرزند رسولؐ کی شہادت کو کائنات کا سب سے عظیم حادثہ تصور کر کے اس دن کو رنج و الم اور حزن و بکا میں گذارتے ہیں۔ (خطط مقریزی)

شیعوں کے دشمنوں کو معلوم تھا کہ یہ سلسلہ حجاج بن یوسف کے زمانہ سے قائم ہوا ہے۔ اور اس میں حجاج کی اہلبیتؑ دشمنی کا پورا پورا ہاتھ تھا لیکن انھوں نے اس بات کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے مظالم کے سلسلہ کو جاری رکھا اور محرّم کو عید بنائے رہے۔ روحِ رسالت تڑپتی رہی اور مسلمان خوشی مناتے رہے۔

سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی ہے۔

اے خدا ہمارے اور اس قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کرنا تاکہ ہمارے دل ہدایت کے بعد منحرف نہ ہوسکیں۔ ہم تجھ پر ایمان لائے اور ہم نے تیرے نبی اور اس کے ان تمام اصحاب کا اتباع کیا ہے۔ جو ان کے راستہ پر گامزن اور ان کی ہدایت کے پرستار تھے۔ ہم ان اصحاب کرام کے پیرو ہیں جنھوں نے دل سے حق کی دعوت قبول کی۔ اخلاص کے جذبہ کے ساتھ عمل کیا۔ امت کے مفاد کو اپنے ذاتی فائدہ پر مقدم رکھا۔ کفار پر سخت اور اہل ایمان پر نرم رہے۔ تیری رضا کے طلبگار اور تیرے دین کے پرستار بنے۔ شعائر اسلام کو ظاہر کیا، فرائض الٰہیہ کو حیاتِ نو بخشی، نبی کریمؐ کی نصرت کی، ان کے ساتھ نازل ہونے والے نور کا اتباع کیا۔ باہمی معاونت سے کام لیا اور تیرے دین کا وقار بڑھایا امت میں برادری کے جذبات استوار کئے۔ اور تیرے عہد کو پورا کیا۔

خداوندا! ہم ان تمام منافقین سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں جو تیرے نبیؐ کے قتل کی سازش میں شریک ہوئے۔ جو دل سے ایمان نہیں لائے اور صرف زبان سے کلمہ پڑھتے رہے۔ تیرے حبیب کے پاس آکر ایمان کی شہادت دیتے رہے اور تو نے ان کی تکذیب کر دی۔ اپنی قسموں کو آلۂ کار بنائے رہے اور تو نے انھیں دین حق کا معاند و مخالف ٹھہرایا۔

وہ منافقین جو تجھے اور تیرے رسولؐ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جنھوں نے ریاکاری کے لئے نمازیں قائم کیں، تیرے ذکر میں کوتاہی کی، کفر و ایمان کے درمیان زندگی گذاری۔ اور گمراہ کے گمراہ ہی رہے۔ جنھوں نے تیرے حبیب سے بغاوت کی اور اہل ایمان سے الگ ایک نیا جادہ اختیار کیا، جن کی سزا تو نے اپنے قرآن میں جہنم قرار دی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اس الزام کی کوئی حقیقت ہوتی تو شیعوں کا اس سے بڑا کوئی جرم نہ ہوتا لیکن افسوس کہ اس تہمت کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ علماء سوء کی طبعزاد داستان اور ضمیر فروشوں کی گڑھی ہوئی کہانی ہے۔ اس کی پشت پر حکومتوں کی خواہش اقتدار اور ملاؤں کی زرپرستی رہی ہے۔ ورنہ کیا یہی انصاف تھا کہ معاویہ کی جماعت پر علمی تنقید کرنے والے گروہ کو ناقابلِ اعتبار اور دین سے منحرف کہہ دیا جائے۔ کیا تقاضائے عدالت یہی تھا کہ حضرت علیؑ پر سب و شتم کرنے والے افراد کی روایتوں کو بہ فخر و ناز بیان کیا جائے اور علیؑ کے دشمنوں سے برائت کرنے والی قوم کے اقوال کو

درخورِ اعتنا نہ قرار دیا جائے۔

افسوس کہ اب اس موضوع کی تفصیل کا موقع نہیں رہا ورنہ ہم یہاں بھی دکھ بھری داستان آپ کے سامنے پیش کرتے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ ساری باتیں عہدِ کہن کی داستانیں بن چکی ہیں۔ انھیں قصۂ پارینہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے کہ اب نہ حکومتوں کا دباؤ ہے اور نہ تعصب کی گرم بازاری لیکن افسوس کہ آج کی کتابیں بھی انھیں قدیم ایام کی یاد تازہ کر رہی ہیں اور انھیں فرسودہ تہمتوں کے زندہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے پاس ان مصائب کے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اس لئے آپ کے ذاتی مطالعہ پر چھوڑ کر آپ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ہمارا وعدہ ہے کہ آئندہ کسی موقع پر صحابۂ کرام کے بارے میں اپنے موقف کا اظہار کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان تہمتوں کا پس منظر کیا ہے؟

اب آپ ہمارے لئے توفیقات کی دعا کریں اور اس وقت کا انتظار کریں جب ہم آپ سے دوبارہ ملاقات کر سکیں اور ہمارا وعدہ وفا ہو سکے۔

والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الذی ارسلہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون وعلیٰ آلہ الذین اذھب اللہ عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا۔

امام جعفر صادقؑ
آپ کا دور اور اس کے مشکلات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمدٍ وآلہ الطیبین وصحبہ المنتجبین

ہمت شکن حالات

تمہید ـــ گزشتہ جلد میں ہم اسلامی مذاہب کی نشو ونما اور اس کے عوامل ومحرکات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں ہم نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے پیش آنے والے بعض مشکلات اور آپ کے دورِ حیات کے بعض سوانح وحادثات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا لیکن ابھی گفتگو ناتمام تھی اس لئے اس موضوع پر مزید بحث ضروری معلوم ہوتی ہے۔

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ امام صادقؑ کے دورِ حیات میں اموی مظالم اس منزل تک پہنچ گئے تھے کہ نہ کوئی شیرخوار بچہ اپنے گہوارہ میں اطمینان کی سانس لے سکتا تھا اور نہ کوئی پیرِ کہن سال اپنے کنجِ خانہ میں۔ حکامِ جور کا کردار صاف بتا رہا تھا کہ خونی انقلاب بہت قریب ہے اور یہ آتش فشاں عنقریب پھٹنے والا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انقلاب آیا اور اپنے چہرہ پر آلِ محمدؐ کی حمایت کا غازہ مل کر آیا۔ اب چاروں طرف ان کے پامال شدہ حقوق اور ان کے بہتے ہوئے خون کی گفتگو تھی۔ ظاہر ہے کہ صادق آلِ محمدؐ اس گھرانہ کی سب سے بڑی شخصیت تھے۔ اس لئے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلاب میں آپ کا کردار کیا تھا؟ آپ نے سیاست وقت

سے کنارہ کشی کی یا بے سروپا تاریخوں کی بنیاد پر مقام ابواء میں ہونے والی کانفرنس میں عبداللہ بن الحسین کے ہاتھ پر سربراہِ ملت کی حیثیت سے بیعت کرلی۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا واقعی جواب اسی وقت معلوم ہوگا جب ہم حالات کا صحیح تجزیہ کرکے انقلاب کے مقاصد، انقلابی مجاہدین کے نفسیات اور ان کے باہمی اختلاف کے باوجود اس ایک مرکز پر اتحاد کے اسباب معلوم کرلیں گے۔

لیکن یہ واضح سی بات ہے کہ خواہشات کے اس طوفان میں امام نے بالکل نیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ نہ آپ نے کسی کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے دی اور نہ اپنے اعزا میں کسی کو اقدام کرنے کی رائے دی۔ آپ قائدینِ انقلاب کے نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ یہ آدمی اپنے ہیں اور نہ یہ زمانہ اپنا۔ بیعت سے اپنے لئے مشکلات پیدا کئے جاسکتے ہیں لیکن اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہیں حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہی سیاسی بصیرت اور حکمتِ عملی تھی کہ امامؑ نے اپنی حمایت کی آوازیں سننے کے باوجود اپنے کو میدانِ جنگ سے الگ کرلیا جس کی تفصیل یہ ہے۔

آپ کے دور کے مشکلات

امام صادقؑ کا دورِ حیات ۸۳ھ سے ۱۴۸ھ تک یعنی عبدالملک بن مروان کی خلافت کے آخر سے منصور کی خلافت کے وسط تک ہے۔ اس دور میں آپ نے بنی امیہ کا کافی دورِ حکومت دیکھا ہے۔ ان کے حکام کے مظالم اور عوام کے ساتھ ان کا برتاؤ دیکھا ہے۔ بارہ سال کی عمر تک اپنے جد بزرگوار امام زین العابدینؑ کے ساتھ رہے۔ ۱۲ سال سے ۳۲ سال تک امام باقرؑ کے زیرِ سایہ زندگی گذاری۔ دونوں کی وراثت، دونوں کا سایۂ عاطفت اور دونوں کا مقدس ماحول پانے کے بعد ۱۱۴ھ سے آپ نے اپنے کمالات کا مظاہرہ شروع کیا۔

امام باقرؑ کا انتقال ہوا تو آپ کے مدرسہ کی وسعتوں نے مکہ، مدینہ اور کوفہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ یہ زمانہ بلادِ اسلامیہ میں فتنوں اور لڑائیوں کا زمانہ تھا۔ حکام میں باہمی اختلافات ارکانِ حکومت کو متزلزل بنائے ہوئے تھے۔ عوام اموی سلطنت کی کھلم کھلا مخالفت کررہے تھے۔

سیاسی جماعتیں سازشوں میں مصروف تھیں اور عمائدِ سلطنت چین کی نیند سو رہے تھے۔ انھیں نہ عوام کی فلاح و بہبود کا خیال تھا اور نہ اپنی صلاح و بقا کا۔ سیاست اور اقتصاد کے بگڑے ہوئے حالات ہر طبقہ کو بدظن بنائے ہوئے تھے۔ ایک کے بعد ایک آنے والا حاکم مزید مشکلات پیدا کر رہا تھا اور پوری سلطنت ایسے طریقِ کار کے سوچنے پر مجبور ہو رہی تھی جس سے امّت کو اس بلاءِ عام سے نجات دلائی جا سکے۔

اقتصادی کشمکش عوام کو اور بھی پریشان کئے ہوئے تھی۔ حکام زیادہ سے زیادہ خراج وصول کرنے کے خواہاں تھے اور عوام کے ساتھ برے سے برے سلوک کو روا سمجھتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ فصل سے پہلے پھلوں کی قیمت لگا کر اپنی ہی قیمت سے سارے پھل خرید لئے جاتے تھے اور بازار کے بھاؤ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (العصر العباسی الاوّل استاد عبدالعزیز دوری)

ناجائز طریقہ سے جزیہ طلب کیا جاتا تھا۔ حد یہ ہے کہ عبدالعزیز بن مروان نے راہبوں تک سے جزیہ وصول کر لیا تھا۔ اور پھر صنعت و حرفت، انشاء و کتابت وغیرہ پر بھی ٹیکس لگائے جا رہے تھے۔

اُدھر امیرِ شام معاویہ نے ساسانی حکومت کے طریقہ کو زندہ کر کے نوروز کے دن ہدیہ و تحفہ وصول کرنا شروع کر دیا تھا اور ایک سال کے تحفہ میں ایک کروڑ ۳۰ لاکھ درہم وصول کر لئے تھے۔ (جہشیاری ص۱)

ہرات کے دہقان خراسانی نے اسد بن عبداللہ قسری عامل ہشام کی خدمت میں ۱۱۹ھ میں ۱۰ لاکھ درہم پیش کئے۔ (تاریخ کامل ص۱۰۱)

۱۲۰ھ میں والیِ ہرات نے دہقان کے ساتھ آ کر سونے چاندی کے مختلف ظروف اور ریشم و حریر کے متعدد کپڑے نذر کئے۔ (طبری ۵ ص۴۹۵ ۱۲۰ھ)

عبدالملک بن مروان نے جزیرہ کے گورنر کو فرمان بھیجا کہ ملک کے ہر شخص کو مزدور فرض کر کے اس کی سالانہ آمدنی کا حساب کر کے اس کی کھانے پینے اور پہننے کی ضرورت بھر نکال کر باقی اس سے وصول کر لیا جائے۔ چنانچہ ہر شخص پر ۴ دینار ٹیکس لگا دیا گیا۔ (الخراج ص۲۷)

یمن کے گورنر محمد بن یوسف نے ملک کے تمام اموال پر قبضہ کر کے خراج کے علاوہ نئے نئے ٹیکس لگا دیئے۔ (السیادۃ العربیہ ص۲۸)

اسامہ بن زید، سلیمان بن عبدالملک کے پاس خراج جمع کرنے کے لئے آیا تو اس نے عرض کی۔ اے امیر یہ مال اس انداز سے جمع ہوا ہے کہ رعایا بالکل بیدم ہوگئی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ خراج کے بارے میں کچھ تخفیف کر دیں تاکہ شہر آباد ہوں اور رعایا خوشحال ہو۔

سلیمان نے جواب دیا کہ تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔ جا اور جا کر پہلے دودھ دوہ لے اور جب دودھ ختم ہو جائے تو خون ہی جمع کر۔ (جہشیاری ص۳۲)

یہی وہ ہمت شکن حالات تھے جن سے ساری رعایا مضطرب تھی۔ حکام وقت کا کام ٹیکس پر ٹیکس عائد کرنا تھا چاہے ملک تباہ ہو یا رعایا برباد۔ گورنروں کا فرض تھا کہ ہر ممکن شدت سے عائد شدہ ٹیکس وصول کریں اس لئے کہ انعام کے امکانات بھی قوی تھے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ والیٔ خراسان کو ٹیکس میں سے دس لاکھ درہم انعام میں دیدیئے گئے تھے۔

یزید بن معاویہ نے عبدالرحمان بن زیاد والیٔ خراسان کو ۲۰ ہزار نقد اور اس سے زیادہ کا مال دے دیا اور اس طرح اس کے مال کا یہ عالم ہوگیا کہ ایک دن اپنے کاتب سے کہنے لگا کہ "مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنا مال گھر میں رکھ کر کس طرح سوتا ہوں" کاتب نے سوال کیا کہ حضور کا مال کتنا ہوگا؟

عبدالرحمٰن نے کہا بازار سے کوئی ضروری چیز خریدے بغیر ہزار درہم روز کے حساب سے سو سال تک کھا سکتا ہوں۔

کاتب نے عرض کی "خدا آپ کو نیند نصیب کرے۔ آج کا سونا تعجب خیز نہیں ہے، حیرت تو اس وقت کی نیند پر ہوگی جب یہ مال نہ رہ جائے گا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کچھ خیانت کی نذر ہوا، کچھ غصب ہوا اور کچھ چوری چلا گیا۔ اور اب یہ حال ہوگیا کہ جلد قرآن کی چاندی بیچ گئی اور ایسے گدھے پر سواری شروع ہوئی جس سے پاؤں زمین پر خط دیتے چلیں۔ اتفاق سے ایک دن مالک بن دینار سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے پوچھا کہ آپ کے مال کا کیا حشر ہوا؟ عبدالرحمٰن نے کہا کہ "سوائے ذاتِ خدا کے کسی کے لئے بقا نہیں ہے"۔ (جہشیاری ص۱۸)

عمر بن عبدالعزیز نے تخت پر آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ایسے تمام ٹیکسوں کی اصلاح کی اور اپنے کوفہ کے گورنر کے نام یہ فرمان لکھا۔ "اہلِ کوفہ نے حکامِ جور کے ہاتھوں کافی مصائب برداشت

کئے ہیں ۔ دین کا خمیر عدل و احسان سے ہے ۔ اپنے نفس کا اہتمام کرو اور اسے گناہوں سے بچاؤ ۔ برباد زمینوں کو آباد پر قیاس نہ کرو ۔ ہر زمین سے بقدر امکان خراج وصول کرو ۔ اضافی ٹیکس مت لو ۔ نوروز عید کے تحفے بند کرو ۔ قرآن کی قیمت ، گھر کا کرایہ ، نکاح کا درہم ، نومسلم کا خراج سب ختم کرو ۔ میری اطاعت کرو ۔ میں نے تمھیں حاکم بنایا ہے ۔ بغیر میری اجازت کے کسی کو کوئی سزا نہ دو ۔ جو شخص حج کرنا چاہے اسے سو درہم فوراً عطا کر دو ۔ (کامل صفحہ ۲۹ ، طبری صفحہ ۱۳۹)

افسوس کہ عمر بن عبدالعزیز کی یہ تمام اصلاحات اس کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں اور یزید بن عبدالملک نے برسرِ اقتدار آتے ہی اپنا فرمان جاری کر دیا کہ "عمر دھوکے میں تھا ۔ اس کی باتوں کو چھوڑ دو ۔ لوگوں کو پہلی حالت پر لے آؤ ۔ ان سے ہر حال میں ٹیکس وصول کرو ، شادابی ہو یا قحط ۔ وہ پسند کریں یا ناپسند ۔ زندہ رہیں یا مر جائیں" ۔ (طبری ، کامل)

سختیاں بڑھ گئیں ۔ امت کی گردن پر نئے نئے بوجھ لاد دیئے گئے ۔ عمال نے شدت برتنا شروع کر دی اور کسی بھی ملک کی گورنری سرمایہ اندوزی کا وسیلہ فرض کر لی گئی ۔ (السیادۃ العربیہ صفحہ ۳۰)

والی بننے کے لئے جن وسائل کو اختیار کیا گیا ان کا ایک خاکہ یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس بلال بن ابی بردہ آیا اور مسجد میں مستقل طور پر معتکف ہو گیا ۔ عمر کو یہ زہد پسند آگیا اور اس نے علاء بن ابی بندار سے کہا کہ اگر اس کا ظاہر و باطن ایک ہے تو یہ بہترین انسان ہے ۔ علاء نے کہا کہ میں ابھی اس کی اطلاع لے آتا ہوں ۔ چنانچہ علاء مسجد میں آیا اور بلال سے کہنے لگا کہ آپ امیر سے میرے تقرب سے واقف ہیں ۔ میں نے ان سے آپ کو عراق کا والی بنانے کی سفارش کر دی ہے ۔ فرمائیے میرا کمیشن کیا ہوگا ؟ بلال نے برجستہ جواب دیا کہ ایک سال کا کل مال یعنی دو کروڑ درہم ۔ علاء نے کہا کہ اسے لکھ دیجئے ۔ بلال نے لکھ دیا ۔ علاء اس تحریر کو لے کر عمر کے پاس آیا ۔ عمر نے اسے دیکھ کر کوفہ کے گورنر کو خط لکھا کہ "بلال نے ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے امتحان کر لیا اور اسے مجسمۂ خباثت پایا" ۔ (کامل مبرد صفحہ ۱۵۸)

ظاہر ہے کہ جو حکومت دلوانے پر اتنا معاوضہ دے گا تو حکومت پانے پر اس سے کہیں زیادہ وصول بھی کرے گا ورنہ اس کی کمی پوری کہاں سے ہوگی ؟

تمہیدِ انقلاب

حکومت نے عراق کی وصولی شیوخ قبائل کے حوالے کردی اور انھوں نے اپنے مظالم شروع کردیئے۔ خراسان میں ٹیکس آدمیوں کے حساب سے لگایا گیا کہ زمین کے حساب سے رُوسا پر زیادہ ٹیکس لگ جاتا اور یہ حکومت کی مصلحت کے خلاف تھا مسلمان ہونے کا ٹیکس بھی فرض کردیا گیا اور اس طرح اسلام کی اشاعت میں عظیم رخنہ پڑ گیا۔ بات صرف یہ تھی کہ اسلام نے جزیہ اور خراج غیر مسلم افراد پر عائد کیا تھا تو لوگوں نے صورتِ حال سے عاجز ہو کر یا اسلام سے اخلاص کی بنا پر اس کے دائرہ میں پناہ لینا شروع کردی۔ حکومت کا بینک بیلنس بگڑنے لگا اس لئے دولت پرست حکومت کا فرض ہو گیا کہ نو مسلم لوگوں پر بھی ٹیکس لگا دے۔ چاہے اسلام کی نشر و اشاعت کا کوئی بھی حشر کیوں نہ ہو جائے۔

تاریخ سے باخبر افراد جانتے ہیں کہ جزیہ و خراج کی کمی سے حکومت کے انتظامات پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا بلکہ اس سے حکام کے ہوا و ہوس کی تکمیل میں رخنہ پڑ رہا تھا اس لئے ان لوگوں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اموییت کے خلاف ایک عام نفرت پھیل گئی۔ ہر شخص احتجاج پر کمر بستہ ہو گیا۔ حکام نے عوام کی فریاد سننا بند کردی۔ مسلمان قرآن و سنّت کی تباہی نہ دیکھ سکے۔ بہتے ہوئے خون، لٹتے ہوئے اموال، لٹتی ہوئی آبروؤں نے مصلحین امّت کو صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔ دن گذرتے گئے، نفرت بڑھتی رہی لیکن ابھی آواز بلند نہ ہو سکی تھی کہ امام حسینؑ کا عظیم الشان اقدام آڑے آگیا جس نے امّت کے شعورِ نفرت کو بیدار کردیا۔ انقلاب کی صدائیں گونجنے لگیں، عوام میں آواز بلند کرنے کی سکت پیدا ہو گئی اور ۶۳ھ میں واقعہ حرہ کے سلسلے میں اہلِ مدینہ نے اپنے احساسات کو منظرِ عام پر لا کر کھڑا کیا۔ (البدایۃ والنہایۃ ۱۰ ص۲۲)

انقلابات اٹھے، خونریزیاں ہوئیں۔ تین دن تک قتلِ نفس، ہتک حرمت، غصب اموال کو مباح بنایا گیا، صحابۂ کرام تہ تیغ ہوئے۔ باقی سے غلامی کی بیعت لی گئی۔ سات سو حاملانِ قرآن قتل ہوئے، ۱۷ سو بقایا مہاجرین و انصار اور دس ہزار عام آدمی کام آئے لیکن انقلابات کی بنیاد

مستحکم ہوگئی۔ ہر طرف انقلاب، ہر طرف احتجاج، ہر طرف خروج، ہر طرف بغاوت اور ہر طرف استنکار ـــــ عراق، حجاز، مصر، اردن سب انقلابات کی آماجگاہ!

مذکورہ بالا حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان لوگوں کے خیالات کی بہ آسانی تردید کی جا سکتی ہے جنھوں نے اموی حکومت کے خاتمہ کو عجموں کے انقلاب کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کے حسب ذیل اسباب قرار دیئے ہیں:۔

۱۔ اموی سلطنت خالص عرب تھی اور اس میں عجم کو کوئی عہدہ نہیں دیا گیا تھا۔

۲۔ عجموں کو عربوں سے شدید نفرت تھی اور عرب اموی حکومت کے نمائندے تھے۔

۳۔ عجموں نے ساسانی اقتدار کو پلٹانے کی کوشش کی تھی اور یہ جنگ صرف نسلی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کرنا چاہتے کہ امویت کے خاتمہ میں موالی عجم کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ خراسان میں ان کی طاقتیں مکمل ہوگئی تھیں۔ ابو مسلم خراسانی نے ان کی قیادت کی تھی لیکن اس بات سے اتفاق بھی نہیں کر سکتے کہ اتنے عظیم انقلاب کو صرف نسلی اور قومی تعصب کے سر ڈال کر امت اسلامیہ کو بالکل بے حس فرض کر لیا جائے اور اس میں حالات کے سمجھنے کی کوئی صلاحیت نہ مانی جائے جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سر زمین فارس میں اٹھنے والے انقلابات کی قیادت بھی سلیمان بن کثیر خزاعی، قحطبہ بن شبیب الطائی اور ابو داؤد شیبانی جیسے رؤسا عرب کے ہاتھ میں تھی۔ انقلاب کے داعی نصر بن صبیح تمیمی، عبد الرحمٰن بن مسلم اور جہم بن عطیہ جیسے عرب ہی تھے۔ نقباءِ انقلاب میں پانچ بنی خزاعہ میں سے، تین بنی تمیم سے اور بعض ربیعہ وغیرہ میں سے تھے۔

یہ کہنا بھی تاریخ سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ اموی حکومت میں موالی کو کوئی عہدہ نہ دیا گیا تھا اس لئے ان لوگوں نے یہ انتقامی قدم اٹھایا تھا۔ اس لئے کہ اموی تاریخ میں دیوانِ رسائل، تحصیلِ خراج، خفیہ، قیادت لشکر، امارت بلاد جیسے اہم عہدوں پر موالی ہی فائز نظر آتے ہیں جس کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

۱۔ سرجون بن منصور۔ معاویہ کا غلام تھا اور معاویہ، یزید، معاویہ بن یزید اور مروان بن الحکم

کے دورِ حکومت میں دیوانِ رسائل پہ مامور تھا۔

۲۔ عبدالرحمٰن بن دراج۔ معاویہ کے یہاں رسل و رسائل کا متولی تھا اور اس کا بھائی خراج پر مامور تھا۔

۳۔ مرداس۔ زیاد کا غلام تھا اور اس کے یہاں دیوان رسائل کا رئیس تھا۔

۴۔ ابوالزرعہ۔ عبدالملک کا غلام تھا اور اس کے یہاں دیوان رسائل کا منتظم تھا۔ اسی دربار میں "امین السر" کا عہدہ بنی عامر کے غلام عمر بن الحارث کے سپرد تھا۔

۵۔ جناح۔ عبدالملک کا غلام تھا اور دیوان خاتم کا رئیس۔

۶۔ ابوالعلاء یزید بن ابی مسلم۔ بنی ثقیف کا غلام اور حجاج کے دربار کا جلاد تھا۔ حجاج کے بعد خراج عراق کا والی قرار پایا۔

۷۔ سعید الصابی۔ ولید بن عبدالملک کے دیوان خاتم کا رئیس۔

۸۔ شعیب العمانی۔ ولید کا غلام اور کاتب۔

۹۔ لیث بن ابی فروہ۔ ام الحکم کا غلام، عمر بن عبدالعزیز کا کاتب۔

۱۰۔ عبداللہ بن ذکوان۔ رملہ بنت شیبہ کا غلام، عراق کا محصل خراج۔

۱۱۔ محمد بن یزید۔ عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے مصر کا والی۔

۱۲۔ سالم۔ سعید بن عبدالملک کا غلام اور ولید کی طرف سے دیوان رسائل کا متولی۔

۱۳۔ عبدالحمید بن یحییٰ۔ علاء کا غلام، مروان الحمار کا متولی دیوان۔

۱۴۔ عثمان بن قیس۔ خالد قسری کا غلام، متولی دیوان۔

۱۵۔ طارق بن زیاد۔ موسیٰ بن نصیر کا غلام، قائد لشکر۔

۱۶۔ نیزک بن صالح۔ عمر بن عبدالعزیز کا غلام، امیر الشاس۔

۱۷۔ اسامہ۔ معاویہ کا غلام۔ مصر کا امیر۔

۱۸۔ طارق بن عمر۔ عثمان کا غلام۔ مدینہ کا والی۔

۱۹۔ عطاء بن یسار۔ ام المومنین میمونہ کے غلام، مفتی شہر۔

۲۰۔ سمنان۔ عبداللہ بن عمرو عاص کے غلام، مصر کے قاضی۔

۲۱۔ ابو رجاء بن حسیب مفتی مصر۔

بلکہ بعض غلام تو ایسے تھے جنھیں امویوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی تھی چنانچہ عطاء بن رباح کے بارے میں یہ اعلان عام تھا کہ خبردار ان کے علاوہ کوئی فتویٰ نہ دے۔ نافع دیلمی۔ ابن عمر کے غلام کو مصر کا معلم بنا دیا گیا تھا۔ دمشق کی مسند قضاوت سلیمان بن ابی موسیٰ المتوفی ۱۱۷ھ کے ہاتھ میں تھی۔ زید بن اسلم عدوی المتوفی ۱۳۶ھ کا مسجد نبوی میں حلقہ درس تھا۔

اس کے علاوہ بے شمار موالی تھے جنھیں حکومت میں بڑے بڑے عہدے تفویض کئے گئے تھے۔ جن کے مفصل تذکرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ موالی کو انقلاب کا ذمہ دار ٹھہرانا بنوامیہ کو ان کے غلط کردار سے محفوظ رکھنے کی ایک سازش ہے جس سے ہمیں کوئی تعجب اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ جب کل مسلمان ان کے خلاف آواز نہ بلند کر سکے تو آج قلم کیا اٹھائیں گے۔ انھوں نے کل ان کے حق میں حدیثیں گڑھی ہیں تو آج ایک مفروضہ تیار کر دینے میں کیا قباحت ہے۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ معاویہ نے یزید سے کہا کہ میں نے تیری ہر خواہش کو پورا کر دیا ہے، اب کوئی تمنا تو نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے جہنم سے بچا لیجئے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ میرے لئے بیعت لے لیجئے۔ اس لئے کہ جس نے امتِ محمدؐ پر تین دن حکومت کر لی وہ عذاب جہنم سے محفوظ ہو گیا۔ (کامل ج ۴ ص ۶۲)

یہ واقعہ اور یہ روایت اس بات کے گواہ ہیں کہ حکام اور ان کے پرستاروں نے اپنی باہمی سازش سے عوام کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی تھی کہ حکام کے بارے میں کوئی سوال و جواب نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کا حاکم ہو جانا ہی ان کی نجات کے لئے کافی ہے۔

حد ہو گئی کہ مسلم بن عقبہ نے مدینہ کو تاراج کر کے مکہ کا رخ کیا اور درمیان میں موت سامنے آ گئی تو کہنے لگا کہ میں نے کلمہ توحید کے بعد اہل مدینہ کے قتل سے بہتر کوئی عمل خیر نہیں کیا ہے اور نہ قیامت کے روز کسی دوسرے عمل سے کوئی امید ہے۔ (کامل ج ۴ ص ۱۶)

اور اسی طرح ولید کے سامنے ۴۰ شیوخ نے اس امر کی شہادت دی کہ خلیفہ پر عقاب نہیں ہو سکتا ہے۔ جس نے تین دن امت پر حکومت کر لی وہ جہنم سے نجات پا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان جعلی

روایتوں کے ذریعہ حکام سے سخت مواخذہ و احتساب کی روایتوں کو عوام کے ذہنوں سے محو کر دیا جائے۔ حالانکہ حدیث صحیح میں یہی تھا کہ رسول اکرمؐ نے جابر بن عبداللہ سے فرمایا ہے کہ "خدا تمہیں بیوقوفوں کی حکومت سے بچائے"۔

جابر نے عرض کی کہ "حضورؐ! یہ بیوقوفوں کی حکومت کیا ہے؟"

فرمایا "میرے بعد ایسے حکام بھی ہوں گے جو میری سنت سے بالکل الگ ہوں گے۔ ان کی تصدیق کرنے والا اور ان کے ظلم کی اعانت کرنے والا مجھ سے بالکل غیر متعلق ہوگا اور جس نے ان کی تصدیق نہ کی اور ان کے ظلم پر اعانت نہ کی وہ مجھ سے ہے اور میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوگا"۔ (مسند احمد ۳ ص۳۲۱)

"میری امت کی ہلاکت اور تباہی قریش کے بیوقوف حکام کے ہاتھوں ہوگی"۔ (مسند احمد ۲ ص۲۵۵)

کعب بن عجرہ نے آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے کہ "عنقریب جھوٹے اور ظالم حکام برسرِ اقتدار آئیں گے۔ جس نے ان کی تصدیق کی اور ان کے ظلم میں ان کی اعانت کی وہ مجھ سے غیر متعلق ہے۔ قیامت کے دن کوثر پر اس کا گذر نہ ہوگا اور جس نے ان کی تصدیق نہ کی وہ مجھ سے ہے اور قیامت کے دن کوثر پہ وارد ہوگا"۔ (تاریخ خطیب ص۳۶۲)

"عنقریب ایسے حکام بھی ہوں گے جو مختلف اسباب سے نماز کو وقت کے بعد پڑھیں گے۔ اس لئے تم وقت سے پڑھا کرو"۔ (مسند احمد ۵ ص۳۱۵)

عوف بن مالک ناقل ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "اگر تم چاہو تو تمہیں حکومت کے بارے میں اطلاع دوں؛ یاد رکھو اس کی ابتداء ملامت سے ہوتی ہے، اس کے بعد ندامت ہے اور آخر میں عذابِ روزِ قیامت۔ سوائے ان لوگوں کے جو انصاف سے کام لیں۔ لیکن قرابت داری میں انصاف کیسے ہوگا؟" (الترغیب والترہیب ۳ ص۱۳۲)

بشر بن مالک آنحضرتؐ سے ناقل ہیں کہ "جو شخص امورِ مسلمین کا حاکم ہوگا اسے روزِ قیامت جہنم کے کنارے کھڑا کیا جائے گا۔ اگر نیک کردار ہوگا تو نجات پائے گا ورنہ وہیں سے جہنم میں گرا دیا جائے گا"۔ (طبرانی)

عمر بن الخطاب راوی ہیں کہ "روزِ قیامت سب سے بہتر انسان امام عادل ہوگا اور سب سے بدتر امام ظالم واحمق۔" (ترمذی، اوسط طبرانی)

انس راوی ہیں کہ "امامِ ظالم کو روزِ قیامت رعایا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ وہ اس سے بحث کر کے اسے شکست دیدیں گے اور اس وقت اس کو جہنم کا حکم مل جائے گا۔" (بزار)

ابوہریرہ ناقل ہیں کہ "ہر دس آدمیوں کے حاکم کو روزِ قیامت گرفتار کر کے لایا جائے گا اور اسے سوائے عدالت کے کوئی چیز نہیں بچا سکتی ہے۔" (مسند احمد)

انس بن مالک راوی ہیں کہ "جس حاکم نے رعایا سے خیانت کی وہ جہنمی ہے۔"

اس کے علاوہ خود معاویہ کے فضائل میں وہ بے شمار جعلی روایتیں تیار کی گئیں جن سے اسلام بیزار اور اہلِ اسلام متنفر تھے۔ احتجاج کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن ایسے دور میں کیا آواز، جہاں زبانوں پر قفل لگے ہوں، شعور پامال ہو رہا ہو۔ اہلِ صداقت کو سزائیں دی جا رہی ہوں اور در بدری کے راستے کھلے ہوئے ہوں۔

حافظینِ احادیث نے اس جعل کو واضح کیا ہے جس کا ایک نمونہ یہ ہے:۔

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ابنِ عمر سے آنحضرتؐ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے بزم میں ایک جنتی کے آنے کی بشارت دی اور اتنے میں معاویہ آ گئے۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا، تیسرے دن پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ (الحلیہ ۱۰ ص۲۱۳)

ہشام بن عروہ نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے معاویہ کے لئے ہدایت اور ہلاکت سے نجات کی دعا کی ہے۔

اس کے بعد محمد بن عبدالواحد کی باری آئی اور اس نے کذب و افترا کا انبار لگا دیا۔ (خطیب ۲ ص۳۰۷)

ابن حجر نے تو مستقل کتاب ہی فضائل معاویہ میں تالیف کر دی جب کہ معاویہ کو فضائل سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا جیسا کہ علامہ امینی "دام ظلہ" نے الغدیر ۱۰-۱۱ میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بات یہیں پر تمام نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد ان کے پایۂ تخت کے بارے میں حدیثیں

وضع ہونے لگیں اور اس کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انقلاب کی شکل بدلنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کی گئی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کے پس منظر میں اموی دور کے وہ مظالم تھے جنھیں نہ اسلام برداشت کر سکتا تھا اور نہ اہلِ اسلام۔ اُمت مصائب کا شکار تھی اور اہلبیتؑ ظلم و ستم کا نشانہ۔ امیوں کا خیال تھا کہ ایسی ظالم و سفّاک حکومت بھی بقاءِ دوام سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ انھیں یہ تصور نہ تھا کہ عام مسلمان بھی "خلافت راشدہ" کے بعد ایسی خونخوار حکومت کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ وہ اسلامی مملکت کو اوج کمال سے قعرِ مذلّت میں گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ایسے حکام کے زیر نگیں نہیں رہ سکتے ہیں جو مظلوم کی فریاد اور ستم رسیدہ کی شکایت سننے سے گریز کرتے ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انقلابات اٹھے۔ اموّیت کی دھجیاں بکھریں اور چند باقی ماندہ لوگ دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ نوبہ پہنچے تو وہاں سے نکالے گئے، بجاوہ پہنچے تو وہاں پناہ نہ ملی، یمن گئے تو وہاں رہنے کی جگہ نہ ملی۔ اور ظالمین پر ارضِ خدا تنگ ہو گئی۔ اس سرگرداں و حیران قافلہ کی قیادت مروان کے بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ کے ہاتھوں میں تھی۔ ایک منزل پر پہنچنے کے بعد راستے میں پہاڑ نظر آیا۔ دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پہاڑ کے داہنے بائیں سے سفر کریں اور ایک ساعت کے بعد ایک مرکز پر مل جائیں۔ چنانچہ دونوں چلے، دن بھر چلتے رہے اور آپس میں ملاقات نہ ہوئی۔ واپس ہوئے تو راستہ نہ ملا ادھر عبداللہ سے حبش کے ایک لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان لوگوں نے عبداللہ کو قتل کر کے اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور تھوڑی دیر کے بعد سارا سامان لوٹ کر ننگا کر کے چھوڑ دیا۔ یہ لوگ صحرا میں مارے مارے پھرتے رہے یہاں تک کہ پیاس سے تباہی کے قریب پہنچ گئے۔ حالت یہ تھی کہ ہاتھ میں پیشاب کر کے اسی کو پی لیتے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد عبیداللہ کے قافلہ سے ملاقات ہوئی۔ ان کی حالت ان سے بھی بدتر تھی۔ چلنے سے پیر زخمی ہو گئے تھے۔ پیشاب پینے سے ہونٹ کٹ گئے تھے۔ حالت تباہ ہو گئی تھی اور اسی حال میں ایک منزل پر قیام کیا۔ وہاں سے تھوڑا سا سامان جمع کر کے مزدوروں کی شکل سے مکّہ میں داخل ہوئے۔ عورتوں نے اپنے قصر دیکھے تو گریہ وزاری کی آوازیں بلند کر دیں اور قدرت نے عبرت و موعظہ کا آخری نمونہ پیش کر دیا۔ (یعقوبی ۳ صفحہ ۸۵)

(العقد الفرید ۳ ص۱۹۸، ص۱۹۹)

کہا جاتا ہے کہ سفاح کے چچا صالح بن علی کے مقدمۂ لشکر کے قائد عامر بن صالح خراسانی نے بنی امیہ کے آخری بادشاہ مروان جعدی کو قتل کر کے اس کے قصر پر قبضہ کیا تو قصر میں داخل ہو کر اس کا سر اس کی بیٹی کی آغوش میں رکھا اور اس سے شام کا کھانا طلب کیا۔ مروان کی بیٹی نے کہا اے عامر کیا یہ بات عبرت کے لئے کافی نہیں ہے کہ تو نے میرے باپ کو قتل کیا اور اس کی جگہ پر بیٹھ کر اس کا کھانا کھا رہا ہے اور یہ کہہ کر باپ سے خطاب کر کے فریاد کی۔

عامر یہ سن کر کانپنے لگا۔ سفاح کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے عامر کو سخت تنبیہ کی۔

(شذرات ۱ ص۱۸۴)

ادھر منصور نے عبیداللہ بن مروان کو گرفتار کرا کے جیل میں ڈال دیا اور ایک دن جیل سے بلوا کر پوچھا کہ بادشاہ نوبہ کے ساتھ تیرا کیا قصہ ہے؟ اس نے کہا کہ اے امیر اب تو گرانی زنجیر سے بولنے کی تاب نہیں ہے۔

منصور نے اسی عالم میں قصہ سنا اور پھر زندان میں بھجوا دیا۔

عبیداللہ رشید کے دور تک قید میں رہا اور وہیں سے واصل ہو گیا۔ (شذرات ۱ ص۱۸۶)

عبداللہ بن علی نے دمشق میں داخل ہونے کے بعد بنی امیہ کی قبروں کے کھودنے کا حکم نافذ کر دیا چنانچہ معاویہ کی قبر کھودی گئی تو اس میں راکھ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ عبدالملک بن مروان کی قبر کھودی گئی تو اس میں کھوپڑی نظر آئی اور یزید کی قبر کھودی گئی[1] تو اس میں راکھ جیسی چیز دیکھی گئی۔ ہشام بن عبدالملک کا جسم نکلوا کر اس پر تازیانے لگوائے اور پھر جلا کر راکھ کو ہوا میں اڑا دیا۔

(کامل ۵ ص۲۰۵)

سلیمان بن علی نے بصرہ میں بنی امیہ کی ایک جماعت کو قتل کرا کے ان کے جسم سر راہ ڈال دیئے اور کتے انھیں کھا گئے۔ ادھر کچھ لوگوں نے فرار اختیار کیا تو ان کے لئے زمین تنگ

---

[1] یزید کی وفات اور اس کی قبر کے بارے میں کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا ہے لیکن اگر بفرض محال اس دور میں کوئی قبر بنا بھی دی گئی ہو تو یزید یا معاویہ کی قبر میں سوائے خاکستر کے اور مل ہی کیا سکتا ہے قسیم النار والجنۃ کی دشمنی خاکستر نہ بنائے گی تو کیا مٹی کا ڈھیر بنائے گی۔ جوادی

ہوگئی۔ عمر بن معاویہ بن عمر بن سینان بن عتبہ مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر خاموشی سے سلیمان کے پاس پہنچ گیا اور جاکر کہنے لگا کہ تمام شہروں سے ٹھوکر کھاکر آپ کے بھروسے یہاں تک آگیا ہوں۔ اگر قتل کردیں تو راحت مل جائے گی اور چھوڑ دیں گے تو محفوظ ہوجاؤں گا۔

سلیمان نے پوچھا تم کون ہو؟ عمر نے اپنا تعارف کرایا۔ پوچھا کیوں آئے ہو؟ کہا کہ عورتوں کی وجہ سے مجبور ہوگیا ہوں۔ سلیمان کو رحم آگیا۔ اس نے پناہ دیدی اور سفاح کو امان کے لئے خط لکھ دیا۔ (کامل ۵ صفحہ ۲۰۶)

ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں مروان بن محمد بن مروان بن الحکم کے قتل کے بعد بنی امیہ کی بساطِ حکومت لپیٹ دی گئی اور عباسیت تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوگئی۔

عباسی دورِ حکومت کا آغاز

دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر نئی حکومت سے بے پناہ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ اموی سلطنت کے خاتمہ پر بھی عوام نے یہ سوچنا شروع کردیا کہ اتنے انقلابات اور اتنی گھمسان کی لڑائیوں کے بعد برسرِ اقتدار آنے والی حکومت کتاب و سنت کی باقاعدہ پیروی کرے گی اور ایک ایسا عادل نظام سامنے لائے گی جس کی ہلکی سی جھلک عمر بن عبدالعزیز کے دور میں نظر چکی ہے۔

نگاہیں تختِ حکومت کی طرف اٹھیں۔ آلِ محمدؐ کی حمایت کے اعلان نے امیدیں باندھیں اور ایک مرتبہ زمامِ اقتدار بنی عباس کے ہاتھوں میں نظر آئی۔ علویین نے قیادت کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور عباسیوں کو اپنی امیدوں کی تکمیل کا موقع مل گیا۔

ظاہر ہے کہ ابتدائے امر سے اس انقلاب میں عباسیوں کا کوئی نام نہیں تھا۔ وہ تو صرف آل محمدؐ کے حقوق کی حمایت اور علویوں کی قیادت کا دم بھر رہے تھے۔ اس لئے انھیں تختِ حکومت پر دیکھ کر مسلمانوں نے پھر اعلانِ مخالفت کردیا۔ عباسیوں نے یہ محسوس کیا کہ قوم ہم سے راضی نہیں ہے اور ایسے اضطرابی دورِ حکومت کو استحکام نہیں مل سکتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں

نے خراسان والوں کو آگے بڑھایا اور انھیں شیعوں کا عنوان دے کر سامنے کر دیا۔ خراسانیوں کو اہمیت دینے کا راز صرف یہ تھا کہ بنی عباس ان کے نفسیات سے آگاہ تھے چنانچہ خراسان انقلاب کا مرکز بن گیا۔ آلِ رسولؐ سے ہمدردی کا اظہار عام ہو گیا، قاتلانِ حسینؑ کی خانہ تلاشی شروع ہو گئی اور حکومت اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی نظر آئی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب مروان الحمار کی لڑکیاں صالح بن علی کے پاس پیش ہوئیں اور ان میں سے ایک نے عرض کی۔ امیر! خدا تم کو تمھارے مقصد میں کامیاب کرے۔ اب ہمارے ظلم کی طرح آپ اپنے رحم و کرم کو عام کیجئے تو صالح نے جواب دیا کہ ہم کوئی رعایت نہیں کر سکتے ہیں کہ یزید نے امام حسینؑ کو قتل کیا ہے۔ ان کے اہلِ حرم کو دربدر پھرایا ہے۔ ان کے سر مبارک کو نیزہ پر بلند کیا ہے۔

بچی نے عرض کی۔ میری درخواست صرف عفو کی ہے۔ (کامل ۵ ص۲۰۲)

مروان کا سر سفاح کے سامنے آیا تو اس نے سجدہ شکر کیا اور پھر سر اٹھا کر کہا۔ اس خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں تم پر کامیاب بنایا اور ہمارا کوئی انتقام تمھارے ذمہ نہیں چھوڑا۔ (کامل ۵ ص۲۰۳)

یہ حالات تھے جنھیں دیکھ کر عوام خوش ہو رہے تھے۔ انھیں ان کی تمنائیں پوری ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ بنو امیہ قتل ہو رہے تھے۔ انھیں آوارہ وطن کیا جا رہا تھا اور شعراء ان اقدامات کی مدح میں قصائد نظم کر رہے تھے۔

عوام میں قدرے سکون پیدا ہوا۔ جب سفاح تختِ حکومت پر آیا اور اس نے افتتاحیہ خطبہ میں اعلان کیا ــــ لوگو! مجھ پر خدا و رسولؐ اور عباس کی طرف سے یہ ذمہ داری ہے کہ میں عدل و انصاف سے حکومت کروں، سیرتِ رسولؐ کو جاری کروں اور بنی امیہ کے نشانات کو مٹا دوں۔ (کامل ۵ ص۱۹۷)

اس خطبہ کا سننا تھا کہ عوام کی ہمدردیاں دوچند ہو گئیں اور سفاح کو چین کی سانس لینے کا موقع مل گیا۔ خون کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اس انقلاب میں ہمارا اپنا کوئی حصّہ نہیں ہے بلکہ اس کی ساری طاقتیں حمایتِ آلِ محمدؐ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اس لئے اس نے سب سے زیادہ قابلِ توجہ علویین کے مسئلہ کو بنایا۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کر کے عوام

کو مطمئن کیا اور استحکام حکومت کا یہ سلسلہ منصور کے دور کے درمیانی حصہ تک چلتا رہا۔ اتنے میں بنی عباس کو اپنے باطنی مقاصد کے اظہار کا موقع مل گیا اور منصور نے آلِ محمدؐ کی تباہی پر کمر باندھ لی۔ اس نے اپنی نظر میں یہ طے کر لیا کہ ان کے ہوتے ہوئے ہماری حکومت میں استحکام نہیں آسکتا ہے اور کسی وقت بھی بغاوت کا امکان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے ان کی پامالی کا انتظام شروع کر دیا اور حالات اس نازک منزل پر پہنچ گئے ——— کہ ایک شاعر کو کہنا پڑا ۔

کاش بنی امیہ کا ظلم ہمارے سروں پر مسلط رہتا
اور بنی عباس کا عدل جہنم واصل ہو جاتا

امام صادقؑ وسط معرکہ میں

امام صادقؑ نے ۸۳ھ سے ۱۳۲ھ تک پچاس سال بنی امیہ کے دورِ حکومت میں گذارے اور اس درمیان اس کے شدائد و مظالم، عوام کے ساتھ ان کا برتاؤ اور بلا خوف آخرت ہونے والے تمام اعمال کا بخوبی مشاہدہ کیا۔ ہر آن کسی چاہنے والے کے قتل اور کسی دوست کی شہربدری کی خبریں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ۱۲۲ھ میں یہ اطلاع بھی ملی کہ حضرت زید کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان کا جسم سولی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ پانچ سال تک جسم اقدس تختۂ دار پر رہا اور اس کے بعد اتار کر نذر آتش کر دیا گیا۔ پھر جناب یحییٰ بن زید کے قتل کا منظر سامنے آیا۔ پھر والد بزرگوار اور جد نامدار کی زہرِ دغا سے شہادت دیکھی اور آئے دن ایک نئی خبر، ایک نیا سانحہ کانوں میں آتا رہا۔

امام کے پیشِ نظر ماضی کے حوادث بھی تھے۔ کربلا کا المیہ مسلسل دل کو تڑپا رہا تھا جس سے سکون حاصل کرنے کے لئے مجالسِ عزا برپا کی جا رہی تھیں۔ شعرا مرثیے پڑھتے تھے اور امام سیلِ اشک بہاتے تھے۔ حرہ کا واقعہ الگ دل کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ حکام کی بے دینی اور ان کا ظلم الگ سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔

انھیں حالات میں امامؑ زندگی بسر کر رہے تھے۔ معاشرہ کی ہر خبر احساس کو مضطرب

کر دیتی تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ حکّام کی طرف سے سخت نگرانی اور لوگوں کے روابط پر شدید پابندی تھی۔ امام کرتے تو کیا کرتے؟ ایک مرتبہ ذمہ دارِ شریعت نے یہ طے کر لیا کہ سیاسی حالات کچھ بھی ہوں مجھے اصلاحِ حالات کے لئے قدم اٹھانا ہے اور لوگوں پر یہ واضح کر دینا ہے کہ بنی امیہ کے ان احکام کو دین و مذہب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف تلوار کی زبان سے بولنا جانتے ہیں اور بس!

ادھر انقلابی مجاہدین نے بھی یہ پیش کش کر دی کہ آپ اس انقلاب کی قیادت فرمائیں تاکہ ہم آپ کی قیادت میں اس ظالم حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ امامؑ نے ان مجاہدین کی نفسیات پر ایک ہلکی سی نظر ڈال کر اس قیادت کو ٹھکرا دیا اور آپ نے دیکھ لیا کہ اس وقت انقلاب کا رخ حمایت اہلبیتؑ کی طرف ضرور ہے لیکن استحکامِ حکومت کے بعد وہ جذبات منظرِ عام پر آجائیں گے جن کے لئے یہ قدم اٹھایا جا رہا ہے۔

امامؑ کا طرزِ فکر یہ تھا کہ خود بھی انقلاب سے الگ رہیں اور اپنے خاندان والوں کو بھی نصیحت کرتے رہیں۔ انھیں اپنی مستقبل بین نگاہوں سے دیکھے ہوئے مناظر سے آگاہ کرتے رہیں اور یہ سمجھا دیں کہ کسی کام میں قبل از وقت ہاتھ ڈال دینا اس کام کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک بے مقصد کام کے لئے اپنے خونِ ناحق کی قربانی کسی طرح روا نہیں ہے۔ بنی عباس ملک و اقتدار کے بھوکے ہیں۔ انھیں نہ آلِ محمدؐ سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ قرآن و سنّت سے کوئی لگاؤ۔ ان کا سارا ڈھونگ تخت و تاج کے لئے ہے جس کے بعد کا منظر بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے چنانچہ ابوسلمہ خلال نے بھی جب عباسیوں کی نیت کا اندازہ کر لیا تو علویین کی طرف عدول کرنے کا ارادہ کر کے اپنے غلام کے ہاتھ ایک خط بھیجا اور اسے تاکید کر دی کہ پہلے امام صادقؑ سے ملنا۔ اگر وہ اقرار کر لیں تو خیر ورنہ عبداللہ المحض سے ملاقات کرنا اور اگر وہ بھی انکار کر دیں تو عمر والاشرف کے پاس خط لے جانا۔ قاصد امام صادقؑ کی خدمت میں آیا۔ آپ نے خط کو دیکھتے ہی فرمایا۔ مجھے ابوسلمہ سے کیا تعلق ہے۔ وہ میرے غیر کا شیعہ ہے۔ قاصد نے عرض کی کہ حضور خط کو تو پڑھیں۔ حضرت نے چراغ قریب منگا کر خط کو اس پر رکھ دیا۔ قاصد نے کہا کہ اس کا جواب؟ حضرت نے فرمایا تو نے تو دیکھ لیا۔

قاصد دوسرا خط لے کر عبداللہ المحض کے پاس گیا۔ انھوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور فوراً امام صادقؑ کے پاس آ گئے۔ کہنے لگے کہ ابوسلمہ نے ایک خط بھیجا ہے۔ جسے میرا خراسان کا ایک شیعہ لے کر آیا ہے اور مجھے اس میں خلافت کی دعوت دی گئی ہے۔

امام صادقؑ نے یہ سنا تو آپ کے تیور بدل گئے۔ فرمایا یہ اہلِ خراسان تمھارے شیعہ کیسے ہو گئے؟ کیا تم نے ابوسلمہ کو بھیجا ہے؟ کیا تم خراسانیوں کے نام سے واقف ہو؟ آخر تم نے انھیں شیعہ کیسے فرض کر لیا۔

عبداللہ نے کہا مجھے تو آپ کے اس کلام میں کوئی غرض معلوم ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ پروردگار عالم نے ہر مسلم پر نصیحت واجب کی ہے اس لئے تم کو آگاہ کر رہا ہوں۔ یاد رکھو یہ حکومت بنی عبّاس ہی کے حق میں تمام ہوگی۔ (الآداب السلطانیہ ابن الصفطقی ص۱۱۱)

ادھر سدیر صیرفی امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ حضور! اب آپ کے بیٹھنے کا جواز کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کیوں؟ عرض کی کہ اب آپ کے انصار و اعوان بہت ہو گئے ہیں حضرت نے فرمایا کہ تقریباً کتنے ہوں گے؟ سدیر نے عرض کی ایک لاکھ! حضرت نے تعجب سے پوچھا ایک لاکھ؟ سدیر نے عرض کی "حضور دو لاکھ کے قریب!" حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ تم کثرت دیکھتے ہو اور میں عاقبت پر نظر رکھتا ہوں۔ (اصول کافی ۲ ص۲۴۳)

بنی ہاشم نے محمد بن عبداللہ بن الحسن کی بیعت کرنا چاہی تو امام صادقؑ نے فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ کرنا۔ اس کام سے تمھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے سفاح کی پشت پر ہاتھ رکھ کر عبداللہ کو سمجھایا کہ خلافت ان لوگوں کو ملے گی۔ اس میں نہ تمھارا کوئی حصّہ ہے اور نہ تمھارے بچّوں کا اور یاد رکھو کہ تمھارے دونوں بچّے قتل کئے جائیں گے۔ یہ کہہ کر آپ اٹھے اور عبدالعزیز بن عمران زہری کو اشارہ سے سمجھایا کہ یہ زرد چادر والا منصور ہی محمد کا قاتل ہوگا۔

عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت بر بنائے حسد یہ بات کہہ رہے ہیں لیکن میں نے اپنی زندگی ہی میں محمد اور ان کے بھائی کا قتل دیکھ لیا۔

(مقاتل الطالبین ص۱۱۷، طبری ۹ ص۲۳۳ ط۱)

علی بن عمرو نے ابن داحہ سے روایت کی ہے کہ امام صادقؑ نے عبداللہ بن الحسن کو

سفاح و منصور کی طرف اشارہ کر کے سمجھایا کہ یہ حکومت ان دونوں کو ملے گی تمھیں اور تمھاری اولاد کو نہ ملے گی۔ ان کے بچے تک حکومت کریں گے اور تمھارا ایک بیٹا مقام "احجار الزیت" میں قتل ہوگا اور دوسرا بھی اس کے بعد تہ تیغ ہوگا۔ یہ کہہ کر آپ غصّہ سے اٹھے اور چل دیئے۔ منصور بھی ساتھ چلا۔ کچھ دور چل کر اس نے کہا۔ آپ نے کچھ سوچا بھی کہ کیا کہہ دیا؟ آپ نے فرمایا کہ خوب سمجھ کر کہا ہے اور خدا کی قسم یہ ہو کر رہے گا.....!

مصائب و خطرات امام صادقؑ کی زندگی کا محاصرہ کئے رہے اور آپ ایک مومن و مخلص دل کے ساتھ ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ ظالم کا ظلم آپ کو فریضہ تبلیغ اور اعلاء کلمہ حق سے باز نہ رکھ سکا۔ آپ نے اپنے لئے ایک نیا راستہ معین کیا۔ خود بھی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے اور اپنے اصحاب کو بھی خاموش تبلیغ پر آمادہ کرتے رہے۔ آپ نے دیکھا کہ ظالم حکومت سے ٹکر لینے کے لئے باہمی اخوت اور مواسات کی شدید ضرورت ہے اس لئے آپ نے تمام تر قوت ایسی اخوت کی ایجاد پر صرف کر دی اور چاہا کہ ایک ایسا معاشرہ ہمہ وقت تیار رہے جو موقع آجانے پر اپنی آواز کو ظالموں کے کانوں تک پہنچا سکے۔

امام صادقؑ کے دور کے سیاسی حالات یہ تھے جن کا آپ ثبات قدم سے مقابلہ کر رہے تھے۔

اسی کے مقابلہ میں اجتماعی اور مذہبی معاملات تھے جن کی راہ اور بھی تاریک اور پر از خطرات تھی۔ سیاسی انقلابات کے ساتھ نئے نئے افکار اور عجیب عجیب خیالات جنم لے رہے تھے۔ مذہب کے ٹھیکیدار نوزائیدہ عقدوں کو حل کرنے سے عاجز اور اسلام کی آبرو کے تحفظ سے قاصر تھے۔ جاہلیت سر ابھار رہی تھی۔ تعصب ملت کو تباہی کی طرف کھینچ رہا تھا۔ امام صادقؑ ان حالات کو برداشت نہ کر سکے اور ایک عزم محکم کے ساتھ ملحدین کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر نئی فکر کا مقابلہ، ہر نئے فلسفہ سے ٹکر۔ ہر نئے مغالطہ کی نقاب کشائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کا زیادہ حصّہ انھیں مناظرات و مباحث میں گذرنے لگا۔

چنانچہ تاریخ نے یہ واقعہ بھی محفوظ کیا ہے کہ عبدالملک دہری مصر سے آنحضرت سے بحث کرنے کے لئے آیا تو آپ نے توحید پر ایسے دلائل و براہین پیش کئے کہ اس نے آپ سے اپنے شاگردوں میں شمار کر لینے کی درخواست پیش کر دی اور حضرت نے اسے اپنے شاگرد ہشام کی شاگردی میں دے دیا۔ (الامام الصادقؑ للمظفر ا صـ۲۱۴)

ایک زندیق نے حضرت سے سوال کیا کہ بغیر دیکھے ہوئے خدا کی عبادت کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ اسے دلوں نے نورِ ایمان سے دیکھا ہے اور عقلوں نے بیدار مغزی سے مانا ہے، آنکھوں نے اس کی حکمت کے مناظر دیکھے ہیں اور کتب و رسائل نے اس کے وجود کا اظہار و اعلان کیا ہے۔ (احتجاج طبرسی، بحار جلد چہارم، اصول کافی)

جعد بن درہم زندیق نے ایک شیشی میں کچھ مٹی اور پانی ڈال کر کیڑے بنا لئے اور لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں ان کیڑوں کا خالق ہوں۔ حضرت تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اس سے ان کے مذکر و مونث کے بارے میں سوال کیا جائے اور کہا جائے کہ وہ اپنے حکم سے ان کی رفتار کا رخ بدل دے ـــــ ابن حجر کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی اس نے مذہبِ الحاد کو ترک کر دیا۔ (لسان المیزان ۲ صـ۱۰۵)

عبدالکریم ابن ابی العوجاء وغیرہ سے آپ کے مناظرے تاریخ میں ایک عظیم شہرت کے مالک ہیں جن کی تفصیل کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی گنجائش!

ابن ابی العوجاء وہی مردود ہے جسے ۱۶۱ھ میں الحاد کی سزا میں قتل کر دیا گیا اور جس نے قتل سے پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ میں نے تمہارے درمیان چار ہزار روایتیں گڑھ کر منتشر کر دی ہیں۔

فتنۂ غلو

امام صادقؑ کے لئے سب سے اہم مشکل غالیوں کا مسئلہ تھا۔ ان مردودوں نے اسلامی جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے اور اپنے مردہ مذہب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ائمۂ اہلبیتؑ

کی طرف منسوب کر کے روایتیں نشر کرنا شروع کر دیں ــــ تاکہ امت کی توجہ ان کی طرف سے ہٹ جائے اور یہ لوگ اپنے منحوس ارادہ میں کامیاب ہو جائیں۔

مغیرہ بن سعید نے امام باقرؑ سے تعلق کا اعلان کر کے آپ کے خلاف روایتیں گڑھنا شروع کیں۔ امام صادقؑ نے اس بلاء ناگہانی کا بھی بر وقت مقابلہ کیا۔ ان ملاعین کے کذب و افترا کا اعلان کیا اور امت کو فی الفور ایک عام قاعدہ عطا کر دیا کہ "جو حدیث، قرآن و سنّت کے موافق ہو یا اس پر ہمارے ہی کلام میں کوئی شاہد موجود ہو اسے قبول کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے" اس لئے کہ مغیرہ بن سعید نے والد بزرگوار کے اصحاب کی کتابوں میں جھوٹی حدیثیں شامل کر دی ہیں۔ خدا کے لئے خدا سے ڈرو اور خدا و رسولؐ کے خلاف ہماری طرف کسی قول کی نسبت نہ دو"

ادھر کچھ غالیوں نے آپ کی خدائی کا بھی اعلان کر دیا۔ آپ نے اس خباثت کا بھی بر وقت تدارک کیا اور تمام شہروں میں اطلاع کرا دی کہ ایسے لوگ ملعون ہیں اور ہم ان سے بیزار ہیں۔ (دعائم الاسلام ص ۶۲)

غالیوں کے مسئلہ میں آپ نے اتنی شدّت اختیار کی کہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ملنا جلنا، شادی بیاہ اور میراث سب کو حرام کر دیا اور جب یہ کوفہ میں قتل کئے گئے تو آپ نے ان سب پر لعنت کی اور ان کے قتل پر اظہار افسوس کرنے والوں کو بھی ملعون قرار دیدیا۔ ابوالخطاب پر خدا و رسولؐ اور ملائکہ و انسان کی لعنت کی، ابوبصیر سے فرمایا کہ جو ہمیں خدا کہے اس سے برأت کرو، ہم بھی اس سے بیزار ہیں اور اس پر خدا کی لعنت ہے بلکہ جو اس میں شک کرے اس پر بھی خدا کی لعنت ہے!

اس کے علاوہ متعدد ارشادات و فرامین میں اس منحوس فرقہ کی مخالفت کا حکم دیا اور قتل کے علاوہ ان کا کوئی علاج تجویز نہیں کیا۔

امام صادقؑ کے اسی جہاد کا نتیجہ تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں دشمنوں کا یہ مشن فیل ہو گیا۔ غالیوں کا ارادہ پہچان لیا گیا اور انھیں اسلامی معاشرہ سے الگ کر دیا گیا اور اب کتابوں کے علاوہ ان کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سیاست کی رفتار ویسی ہی بے ڈھنگی رہی۔ اور آج بھی "اندھے اہلِ قلم" "تفرقہ پرداز مؤلفین" غالیوں کا وجود ثابت کر کے انھیں شیعوں کا ایک فرقہ شمار کرنا چاہتے ہیں تاکہ مذہب اہلبیتؑ سے منحرف کرنے کا جو مشن کل فیل ہو چکا ہے اسے آج کامیاب بنا سکیں۔

ــــــــــــــــ

امام صادق کا مدرسۂ فکر
اور
اس کے تعلیمات

مدینہ

وہ مقدس شہر جہاں صحابہ و تابعین اور بڑے بڑے علمائے امت آباد تھے، فقہ کے بڑے بڑے حلقے قائم تھے۔ چاروں طرف سے طالبانِ علوم آرہے تھے اور حافظانِ حدیث فقیہ عصر بن کر نکل رہے تھے۔ یہ رسولؐ کا دارالہجرۃ، شریعت کا وطن، نور کا مرکز اور اسلامی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ یہیں وہ اہلبیتؑ آباد تھے جنھیں آیت تطہیر نے مرکزِ طہارت قرار دیا تھا۔ جو سعید بن مسیب کی زبان میں "علم کے حامل، ہدایت کے پرچم اور اسلام کے حکمراں تھے"۔ اور مسلم بن ہلال عبدی کی زبان میں "نورِ خلافت کا مرکز اور گھرانا نبوت کا مظہر تھے"۔

اسی مقدس شہر اور پاکیزہ گھرانے میں امام صادقؑ نے زندگی کے ابتدائی دن گذارے، نبوت کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ایمان کی چار دیواری میں پلے بڑھے اور مرکز وحی کے پیغام کو نشر کرنے کے ذمہ دار بن گئے۔ آپ کا مدرسہ مستقل، ثابت قدم اور ہر دورِ حکومت سے مقابل رہا۔ تہذیبِ نفس، بلندئ عقل اور معراج کمال کے تمام ذخیرے آپ کے یہاں مہیا تھے۔ اس مدرسہ کا مقصد لوگوں کی فکر و نظر کی بلندی اور ان کی اصول اسلام سے واقفیت تھی۔ احکام دین کا رواج اور اجتماعی مشکلات کا حل اس کا خاص ہدف تھا۔ مدینہ کی بہار کا زمانہ وہی تھا جب یہ مدرسہ عروج کی منزلیں طے کر رہا تھا، چار طرف سے وفد آرہے تھے اور علوم رسالت کی بھیک سے اپنی جھولیاں بھر رہے تھے۔ سیاسی حالات قدرے خوشگوار تھے اور لوگ مشکلات کو حل کرانے کے لئے ہجوم کئے ہوئے تھے۔ امت نے اس مدرسہ سے اتنا حاصل کیا جس کا چرچا شہر شہر اور ملک ملک ہوگیا۔ (صواعق ص۱۲۰)

مالک بن انس جو سیاسی اقتدار پانے سے پہلے اس مدرسہ کے باقاعدہ طالب علم تھے۔ ان کا بیان ہے کہ امام صادقؑ اکثر تبسم فرمایا کرتے تھے لیکن جب آپ کے سامنے رسول اکرمؐ کا ذکر آجاتا تھا تو چہرۂ مبارک زرد ہو جاتا تھا۔

حدیث بیان کرنے کے لئے طہارت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے ان کو یا تو نماز کی حالت میں دیکھا ہے یا خاموش پایا ہے یا پھر تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ بے معنی کلام آپ کی ذات سے بعید تھا۔ آپ ان علماء میں سے تھے جن کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے۔ (التوسل والوسیلہ ابن تیمیہ ص۵۲ ط ۲)

حافظ نیشاپوری کی روایت ہے کہ آپ اکثر حدیث بیان کیا کرتے تھے، لطفِ مجلس اور افادۂ اجتماع آپ کے یہاں تھا۔ رسول اکرمؐ کا ذکر آجاتا تھا تو چہرہ کا رنگ بدل جاتا تھا۔ حج کے موقع پر احرام باندھنے کے بعد وہ ہیبت طاری ہوتی تھی کہ آواز گلوگیر ہو جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سواری پر ٹھہر نہ سکیں گے۔ (الروضہ حافظ نیشاپوری)

تعلیمات

انھیں علمی اجتماعات میں امام صادقؑ کے تعلیمات نشر ہوتے تھے۔ آپ کا کام اسلامی نفوس میں فضیلت کی تخم ریزی اور خیر و برکت کی آبیاری تھا۔ آپ کی گفتگو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوتی تھی۔ نفوس کی تطہیر، اصلاح و ہدایت کے خطوط کا تعین، آپ کا خصوصی مقصد تھا۔ آپ نے ایک طرف امّت کے دل میں خوفِ خدا اور اس کے احکام کی پابندی کا ذوق پیدا کرایا تو دوسری طرف انھیں عمل پر آمادہ کیا۔ تجارت کی تعبیر عزت سے کی جیسا کہ معلّی بن خنیس کا بیان ہے کہ ایک دن مجھے بازار جانے میں دیر ہوگئی تو حضرت نے فرمایا کہ اپنی عزت کی طرف جاؤ۔ ایک دوسرے شخص سے فرمایا کہ تم آج صبح اپنی عزت کی طرف نہیں گئے۔ اس نے کہا کہ میں ایک جنازہ میں چلا گیا تھا ـــــ فرمایا بہرحال اپنی عزت کو فراموش نہ کرنا۔ معاذ نے اپنی تجارت ترک کردی تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو تجارت مت چھوڑو۔ اس سے عقل جاتی رہتی ہے۔ اپنے

عیال کے رزق میں وسعت دو تاکہ وہ تمھاری شکایت نہ کریں۔

ایک دن آپ نے ایک صحابی کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ حج کے لئے کیوں نہیں گیا؟ لوگوں نے عرض کی کہ اس نے تجارت چھوڑ دی ہے، اب سرمایہ کم ہوگیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ آپ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا تجارت کو مت چھوڑو ورنہ بیکار ہو جاؤ گے۔ تجارت کرو اسی میں برکت ہے۔

معاذ کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ سے عرض کی کہ حضور میں بازار چھوڑنا چاہتا ہوں۔ ـــــ فرمایا کہ اس کے نتیجہ میں تمھاری رائے کا وزن کم ہو جائے گا اور تم سے کسی بات میں مدد نہ لی جائے گی۔

اس قسم کے بے شمار ارشادات ہیں جن میں امت کو تجارت اور کاروبار پر آمادہ کیا گیا ہے تاکہ کسی کے دستِ نگر بن کر ذلیل نہ ہوں۔ اپنا وقار باقی رکھیں اور اپنے اہل و عیال کے رزق کا انتظام کرتے رہیں اور اپنے سے پست طبقہ کی امداد بھی کر سکیں۔ لیکن چونکہ مال کی محبت سے خطرات بھی لاحق تھے اس لئے اس نکتہ کی طرف بھی متوجہ فرمایا: "دیکھو طلب معیشت کو بیکار آدمی سے زیادہ اور دنیا کے حریص آدمی سے کم ہونا چاہئے۔ اپنے نفس کو حرص سے محنت کی منزل میں لے آؤ اور ضعف و سستی سے بلند و بالا بناؤ۔ اتنا حاصل کرو جتنا ایک مومن کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

آپ کے پیشِ نظر یہ بھی تھا کہ خرچ میں زیادتی انسان کی اقتصادی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے اس لئے اس نکتہ کو بھی سمجھا دیا کہ "فضول خرچی سے فقیری پیدا ہوتی ہے اور میانہ روی سے مالداری وجود میں آتی ہے"

عمل

امام صادقؑ نے امتِ اسلامیہ کو کاروبار پر آمادہ کرنے کے لئے علمی اور قولی دونوں قسم کی جدوجہد جاری رکھی۔ کبھی اپنے بیان سے عمل کی ترغیب دلائی اور کبھی خود بنفس نفیس محنت

کرکے اس کی خوبیوں کو آشکار کیا۔

ابو عمر شیبانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت کو پھاوڑا لئے ہوئے کام کرتے دیکھا تو عرض کی کہ یہ آپ مجھے عنایت کردیں۔ میں یہ کام کر دوں گا۔

فرمایا کہ مجھے طلب معیشت کے لئے دھوپ کی گرمی کو برداشت کرنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

(اسماعیل بن جابر نے بھی اسی قسم کا قصہ بیان کیا ہے۔)

فضل بن قرہ ناقل ہیں کہ میں نے حضرت کو ایک قمیص پہنے ہوئے پھاوڑا اچلاتے دیکھا تو صورتِ حال کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ کام دوسروں سے بھی کرا سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھے بھی رزقِ حلال کی طلب میں جدوجہد کرتا ہوا دیکھے۔

اس ترغیب وتحریص کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ بیکاری انسان کی عزت کو گرا دیتی ہے اور اس کے ذہن میں احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔

اللہ نے انسان کو جسم وعقل کی قوتیں عنایت کی ہیں تو اس کے لئے کسی طرح بھی روا نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں کو معطل کر دے اور خود دوسروں کا دست نگر بن جائے۔

روایت نے دین ودنیا دونوں کے لئے عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "دنیا کے لئے اس طرح کام کرو کہ گویا ابھی بڑا موقع ہے اور آخرت کے لئے اس طرح عمل کرو کہ گویا کل مرجانا ہے"۔

ایک مقام پر اعلان ہوتا ہے کہ "دوسرے کے سر اپنا بوجھ ڈالنے والا ملعون ہوتا ہے۔ اپنے عیال سے غافل ہونے والا بھی ملعون ہوتا ہے"۔

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ "راہِ خدا میں جہاد کے لئے نکلنا اولاد واطفال کے لئے طلبِ رزق کی کوشش سے زیادہ اہم نہیں ہے"۔ "طلبِ معاش کے لئے نکلنے والا راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کے مانند ہے"۔

امیر المومنینؑ کا عام دستور تھا کہ کسی شخص کو بھی دیکھ کر اس کے کام بارے میں سوال کرتے تھے اور اگر اس نے اپنی بیکاری کا اظہار کر دیا تو وہ آپ کی نظروں سے گر جاتا تھا۔ اور اسی لئے

امام صادقؑ نے معاذ سے فرمایا تھا کہ اگر تجارت چھوڑ دو گے تو لوگوں کی نظروں سے بھی گر جاؤ گے اور لوگ تم سے مدد بھی نہ مانگیں گے۔

عمل کی پرزور ترغیب و تحریص کے بعد آپ نے مالیات کا مکمل نظام بھی سمجھایا۔ ملکیت اور اس کے انتقال کے قواعد بھی بتائے کہ شعبۂ مالیات ہی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا اہم ترین محرک ہے۔ اس کی تنظیم زندگی کے تمام شعبوں سے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ حسن بن علی بن شعبہ تحف العقول میں روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ سے معاشیات کے معاملات اور اکتساب و خرچ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ انسان کے تمام معاملات جن سے کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے چار قسم کے ہیں۔ ان میں حلال بھی ہیں اور حرام بھی ہیں۔ انسان کا فریضہ ہے کہ حلال کو اپنائے اور حرام سے پرہیز کرے۔

اکتساب کی پہلی قسم ولایت (ملازمت) ہے۔ اس کے بعد صنعت، اس کے بعد مزدوری اور اجارہ۔ ملازمت کی حلال صورت ان حکام کی ملازمت ہے جنہیں اللہ نے ولایت عطا کی ہے۔ ان کی ملازمت، تقویت، اعانت اور شرکت سب حلال ہے لیکن ظالم بادشاہ کی ملازمت اور اس کے لئے کام کرنا اور اس کی اعانت کرنا یہ سب حرام ہے۔ اس میں حق کی تباہی کا اندیشہ ہے۔ ہاں بربنائے مجبوری خون کا پینا یا مردار کا کھانا بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے چاروں قسموں کے تفصیلات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جسے صاحبِ تحف العقول نے اپنی کتاب میں اور محدث عاملیؒ نے وسائل الشیعہ میں درج کیا ہے۔

اسلامی برادری

آپ نے اپنے مختلف بیانات میں اسلامی برادری اور اس کے حقوق پر شدت سے زور دیا ہے کہ اس طرح امّت کے دلوں میں محبت و الفت پیدا ہو گی اور محبت تنظیم عالم و آدم کا بہترین ذریعہ ہے۔

کراہت و نفرت، باہمی عداوت کا سرچشمہ ہے۔ نفرت کی آنکھ خوبیوں کو نہیں دیکھ سکتی

ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ عیوب پر رہتی ہے اور عیب جوئی ہزار اختلاف کی بنیاد ہوتی ہے۔ شیرازۂ اسلامی کو منظم رکھنے کے لئے اخوت اور برادری کا لحاظ انتہائی ضروری ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے بھی اپنے اصحاب میں مواخات قائم کی تھی اور قرآن نے بھی اہلِ ایمان کی برادری کا اعلان کیا ہے۔

حضور اکرمؐ نے برادری کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ آپ اپنے بھائی کے لئے انہیں چیزوں کو پسند کریں جنھیں اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے بھائی بھی آپ سے ویسا ہی سلوک کرے گا اور آپ کا نفس دونوں جہتوں سے مطمئن ہوگا۔ اس جہت سے بھی کہ آپ نے دوسرے کے لئے خیر ہی چاہا ہے اور اس جہت سے بھی کہ دوسرا آپ کے لئے شر نہیں پسند کر سکتا ہے۔

یہی وہ اجتماعی خوش بختی اور معاشرتی اصلاح تھی جس کے پیشِ نظر امام صادقؑ نے باہمی اخوت پر زور دیا تھا اور کسی وقت بھی مسلمان کو اپنے بھائی کے حالات سے غافل نہیں ہونے دیا تھا۔

صفوان جمال راوی ہیں کہ مکّہ سے ایک شخص میمون نامی امام صادقؑ کی خدمت میں آیا اور آپ سے کرایہ کے ختم ہو جانے کی شکایت کی۔ آپ نے اس کی حاجت پوری کرنے کا حکم دے دیا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا اور اس کی حاجت پوری کر کے پلٹ کر آیا تو حضرت نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے صورتِ حال کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ "ایک مومن کی حاجت کا پورا کر دینا ہفتہ بھر کے طواف سے بہتر ہے۔" اس لئے کہ حاجت روائی سے محبت و الفت پیدا ہوتی ہے اور محبت و الفت سے اجتماعی فوائد تشکیل پاتے ہیں۔ نفرت اختلافات کا سرچشمہ ہے۔

محبت چشم پوشی کی دعوت دیتی ہے اور نفرت اظہارِ عیوب کی۔

محبت محبت پیدا کرتی ہے اور نفرت نفرت۔

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "عدالت محبت کی جانشین ہے۔"

سقراطیس کا کہنا تھا کہ دنیا کا کوئی شخص محبت کے بغیر نہیں جی سکتا ہے چاہے ساری دنیا اس کی طرف مائل کیوں نہ ہو جائے۔ جو شخص محبت کو حقیر سمجھتا ہے وہ خود حقیر و صغیر ہوتا ہے۔

امام صادقؑ کے یہ تعلیمات زبان ہی کی حد تک محدود نہیں تھے بلکہ عملی میدان میں بھی آپ نے

بڑے بڑے مجاہدات کئے ہیں ــــ اجتماعی محبت واخوت کی ایجاد کے لئے اپنے ذاتی سرمایہ سے کافی حصہ صرف فرمایا ہے جیسا کہ سعید ابن بیان "رئیس قافلہ حجاج" کا بیان ہے کہ میں اپنے داماد سے ایک میراث کے بارے میں جھگڑا کر رہا تھا کہ اتنے میں مفضل بن عمر کا گذر ہو گیا۔ انھوں نے کچھ دیر توقف کیا۔ اس کے بعد فرمایا میرے ساتھ چلو۔ ہم لوگ ان کے ساتھ گئے اور انھوں نے چار سو درہم پر صلح کرادی اور اسے اپنے پاس سے عطا کر دیا۔ ہم لوگوں نے مال لے لیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ میرا مال نہیں ہے بلکہ یہ مجھے امام صادقؑ نے بطور امانت عطا فرمایا ہے کہ میں اس سے اختلافات کو رفع کرا کے صلح کرایا کروں۔ (اصول کافی ج ۲ ص ۲۰۹ ط ۲ دار الکتب الاسلامیہ طہران)

ظلم سے مقابلہ

انسانی عقلوں کا متفقہ فیصلہ اور عقلائے عالم کا اجماعی مسلک ہے کہ ظلم ایک بدترین صفت اور عدل ایک بہترین خصلت ہے۔

عدل خوبیوں کا سرچشمہ اور فضیلت کی پھڑکتی ہوئی نبض ہے۔

اسلام نے عدل کے قیام کے لئے بے پناہ اہتمام کیا ہے اور اس سلسلے میں کسی نقطہ کو فروگذاشت نہیں کیا ہے۔

امام صادقؑ نے ظلم کی ممانعت، ظالمین کی امانت سے انکار اور ان سے دوری پر شدت سے زور دیا ہے اور اس طرح ہر امکانی کوشش کی ہے کہ لوگوں کے قطع تعلق سے ظلم کی بنیادیں منہدم ہو جائیں اور عدل کا نظام بر سر اقتدار آجائے۔

امام عادل امیر المومنینؑ کا ارشاد تھا کہ "کانٹوں پر لیٹ کر رات بسر کر لینا اور زنجیروں میں جکڑ کر کھینچا جانا ظالم ہونے سے کہیں زیادہ بہتر ہے"۔

"اگر مجھے ساتوں اقلیم کا بادشاہ بنا دیا جائے اور یہ مطالبہ ہو کہ ایک چیونٹی پر ظلم کر کے اس کے منہ سے دانہ جو چھین لوں تو یہ میرے بس سے باہر ہے"۔

اہلبیتؑ کا یہی مشن تھا جو ظالمین کی نظروں میں کھٹک رہا تھا اور وہ ہر وقت ان حضرات

اور ربیع سے معاملت کرتے ہو۔ آخر اس وقت کیا کرو گے جب تمہارا نام ظالموں کے مددگاروں میں پکارا جائے گا؟

یونس بن یعقوب کو ظالموں کی مسجد بنانے تک سے روک دیا۔

ایک شخص نے ظالمین کے یہاں معماری اور ان کو چیزیں کرایہ پر دینے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں ان کے لئے ایک گرہ باندھنا، ایک ظرف ڈھکنا، ایک قلم کھینچنا تک پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ظالموں کے مددگار روز قیامت جہنم کے طبقات میں رہیں گے۔

اس نے گھبرا کر عرض کی کہ اب ایسا نہیں کروں گا اور سوچتا ہوا پلٹا کہ حضرت نے مجھے صرف اس لئے منع کیا ہے کہ مجھ سے بھی ظلم وجور کا اندیشہ ہے۔ اب میں آپ کے پاس جا کر ہر ممکن قسم کھاؤں گا کہ میں ظلم نہ کروں گا۔ آپ مجھے اجازت دے دیجئے ــــــ یہ طے کر کے حضرت کے پاس آیا اور صورت حال کو بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تم نے کیا کہا؛ میں نے دوبارہ ساری قسمیں کھائیں۔ آپ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ آسمان تک پہنچ جانا آسان ہے لیکن یہ اجازت ممکن نہیں ہے۔ (تجارت جواہر ص۳۶)

اس بے پناہ شدت کے باوجود حضرتؑ نے ان مواقع پر ظالمین کی ملازمت کو جائز بھی قرار دیا ہے۔ جب مومنین کا فائدہ، امت کی اصلاح، تعلیمات اسلام کے رواج اور محرمات کی ممانعت کے امکانات قوی ہوں۔ چنانچہ مختلف احادیث میں اس حقیقت کا اعلان بھی کیا گیا ہے جیسا کہ اہواز کے امیر نجاشی کے نام آپ کے مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے۔ (وسائل کتاب التجارہ)

ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ پروردگار عالم نے ظالمین کے دروازے پر ایسے افراد بھی رکھ دیئے ہیں جن کی دلیل واضح ہو اور جن سے قیام عدل کے امکانات ہوں۔ وہ اولیاء خدا کی طرف سے دفاع کریں اور امور مسلمین کی اصلاح کا انتظام کریں۔

آپ نے اپنی پوری زندگی منفی سیاست میں گذار دی اور آپ کا تمام تر مقصد یہ رہا کہ ہمارے چاہنے والے ظالمین سے امکان بھر علیحدگی رکھیں۔

چنانچہ استاد توفیق فکیکی نے اپنی کتاب "حیات الصادقؑ" ص۱۴۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ سیاست میں عدم تعاون اور منفی طرز عمل کی بنیاد امام صادقؑ سے پڑی ہے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ حقوق

کا احترام نہ کرنے والی حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ ایسی حکومت قانون و قاعدہ، عہد و پیمان، دستور و اصول، حقوق و فرائض کا استہزاء کرتی ہے اور فساد فی الارض کے جملہ وسائل مہیا کر دیا کرتی ہے۔

آپ نے ہر شخص پر حسب حیثیت عدم تعاون کو فرض کیا ملازمتوں سے روکا، عذاب الٰہی سے ڈرایا اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک مستقل دستور بنا دیا کہ اب کوئی مصلح یا خادم یا پابند حقوق انسان قہر و غلبہ اور جبر و استبداد کے مقابلہ میں اس سے بہتر سیاست نہیں اختیار کر سکتا ہے۔ یہ قانون قوت ایمان سے معمور دل، حرارتِ عقیدہ سے تڑپتے ہوئے نفس، پاکیزہ روح اور "ظلم دشمن مزاج" رکھنے والے افراد کے لئے ہے۔ دوسرے شخص میں اس کی صلاحیت و استعداد نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔

امام صادقؑ نے اس حقیقت کو بھی تشنۂ اظہار نہیں چھوڑا ہے کہ ظلم کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا دائرہ صرف سلطان جابر کی ملازمت تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے وہ تمام معاملات ظلم میں داخل ہیں جن میں کسی کی حق تلفی کا امکان ہو۔

ابو حمزہ نے آپ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "ظلم کرنے والا کوئی خیر نہیں کر سکتا ہے ظالم مظلوم سے اتنا مال نہیں لیتا ہے جتنا مظلوم ظالم کے دین میں سے لیتا ہے"۔

"جو انسان دوسروں سے برائی کرتا ہے وہ اپنے ساتھ برائی کا بھی انتظام کرے"۔

"جس نے برادرِ مومن کا مال کھایا اس نے جہنم کے شعلے کھائے"۔

"خبردار! کسی مظلوم کے خلاف ظالم کی مدد نہ کرنا۔ ورنہ مظلوم کی فریاد کے مقابلہ میں کوئی دعا قبول نہ ہوگی"۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "مظلوم کی دعا ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے لہذا ہر ایک کو دوسرے کے کام آنا چاہئے۔ مسلم کی اعانت خیر اور ایک مہینہ کے روزوں سے زیادہ بہتر ہے بلکہ مسجد الحرام میں اعتکاف سے بھی افضل ہے"۔

"جس نے مظلوم کے مقابلہ میں ظالم کی اعانت کی اللہ اس سے اس وقت تک ناراض رہے گا جب تک اپنے ظلم سے دست بردار نہ ہو جائے"۔

عزتِ نفس

• عزتِ نفس اور خودداری کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا احترام کرے۔ اسے اس کا واقعی رتبہ عطا کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے خودداری کے جذبہ کو ٹھیس لگے۔

امام صادقؑ نے اپنے جہادِ مسلسل میں اس پہلو پر بھی بیحد تاکید کی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "مومن کے لئے اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے"۔

پوچھا گیا کہ نفس کو ذلیل کرنے کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا کہ انسان کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے بعد میں معذرت کرنا پڑے۔

طلب معاش کی تاکید اور مختلف محرمات کی ممانعت کا فلسفہ بھی انسان کی خودداری ہی میں مضمر ہے اور اسی بیش بہا جوہر کی حفاظت کے لئے یہ تمام کوششیں کی جا رہی تھیں۔

عزتِ نفس کے اہم اسباب میں عفت، قناعت، امانت، صبر اور صدق و وفا ہیں اور اس کے سب سے بڑے مہلک جراثیم جھوٹ، خیانت، ریاکاری، جعل سازی اور لالچ وغیرہ ہیں۔

ان فضائل سے عزتِ نفس میں اضافہ اور ان رذائل سے عزتِ نفس میں کمی کوئی محتاج استدلال بات نہیں ہے۔ انسان فطری اعتبار سے ان حقائق سے آگاہ ہے اور اسلام نے بھی انھیں نکات کی تائید کی ہے۔

امام صادقؑ کا بیان ہے کہ "جس نے اپنے کو شر سے بچائے رکھا وہ عزت دار ہے"۔

"مومن کے لئے دین میں قوت، نرمی میں احتیاط، یقین میں ایمان، فقہ میں حرص، ہدایت میں نشاط، استقامت میں نیکی، علم میں حلم، نرمی میں ہوشیاری، حق میں سخاوت، مالداری میں میانہ روی، فاقہ میں تحمل، قدرت میں عفو، نصیحت میں اطاعت، خواہش میں رکھ رکھاؤ، رغبت میں پرہیز، جہاد میں شوق، مشغولیت میں نماز، شدت میں صبر، سختیوں میں وقار، نرمیوں میں شکریہ کا انداز ہوتا ہے۔ وہ نہ غیبت کرتا ہے نہ غرور، نہ قطعِ رحم کرتا ہے نہ سستی۔ نہ بدکلام ہوتا ہے نہ ترش رو۔ اس کی نگاہ غلط انداز نہیں ہوتی ہے۔ اس کا پیٹ رسوا کن نہیں ہوتا ہے۔

اس پر شہوت غالب نہیں آتی ہے۔ وہ نہ حسد کرتا ہے نہ چوری اور نہ ظلم۔"

"اللہ نے مومنین کو تمام اختیارات دے دیئے ہیں لیکن اپنے نفس کو ذلیل کرنے کا اختیار نہیں دیا ہے۔ ارشاد احدیت ہے کہ عزت صرف اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کے لئے ہے۔ مومن عزیز ہوتا ہے ۔ ذلیل نہیں ہو سکتا ہے۔ مومن پہاڑ سے زیادہ بلند ہوتا ہے پہاڑ اس کے مقابلہ میں چھوٹا ہوتا ہے۔ پہاڑ توڑا جاسکتا ہے لیکن مومن کا ایمان کم نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

اس کے علاوہ بے شمار ارشادات ہیں جہاں بزدلی، کمزوری، خود فروشی اور خود فراموشی سے روکا گیا ہے کہ ان باتوں سے دین میں کاہلی، تبلیغ میں سستی، خدمتِ دین میں کمی اور معمولی مصائب میں اضطراب جیسی مذموم صفتیں وجود میں آجاتی ہیں۔

قوتِ ارادی

ارادہ قوتِ عمل کا وہ اوّلین محرک ہے جس کے بل بوتے پر طبیعت کے مختلف رجحانات اور نفس کے گوناگوں خواہشات کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ارادہ کی طاقت انسانی کردار میں فضیلت کے لئے سب سے بڑی بنیاد اور رذائل کے لئے سدِ سکندری کی حیثیت رکھتی ہے۔ قوی الارادہ انسان ہی وہ صاحبِ عظمت ہوتا ہے جو اپنے عزائم سے عجائبِ روزگاری ایجاد کرتا ہے۔ جسم کی طاقت، ارادہ کی بلندی اور قوت کے مقابلہ میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ "کوئی بدن ارادہ و عزم سے کمزور نہیں ہوتا ہے۔"

"قوتِ ارادی کا مالک ایک معاشرہ اور سماج کی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکتا ہے۔ خیر و برکت کے چشمے اس کی ٹھوکر سے برآمد ہوتے ہیں۔ شخصیت سازی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔"

امام صادقؑ نے قوتِ ارادی اور اس قسم کے دیگر فضائل و خصائل کی طرف متوجہ کر کے انسان کو اس کی صحیح عظمت و منزلت سے روشناس کرایا ہے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر ایک ایسی روح پیدا ہو جائے جس میں اسلامی اخلاق کی جھلک اور مذہبی تعلیمات کی آئینہ داری ہو۔ حضرت کے یہ ارشادات مختلف مقامات پر منتشر طریقہ سے نظر آتے ہیں۔ کاش

آپ کی زندگی بھر کی جہدِ مسلسل کا یہ خلاصہ کسی ایک شکل میں مرتب ہو جاتا اور امتِ اسلامیہ اسے مشعلِ راہ بنا لیتی۔

خطوط و نصائح

امام صادقؑ نے اپنے مختلف خطوط و مراسلات میں امت کو وہ گراں قدر نصائح اور مواعظِ حسنہ عطا فرمائے ہیں جن کی نظیر اخلاقی دنیا میں ناممکن ہے۔ عبداللہ نجاشی کے خط کی تفصیل عبداللہ بن سلیمان نوفل نے یوں بیان کی ہے کہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ اتنے میں نجاشی کا غلام آگیا اور اس نے حضرت کو ایک خط دیا۔ آپ نے اسے پڑھا تو اس میں یہ عبارت درج تھی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خدا آپ کو باقی رکھے اور مجھے آپ کا فدیہ قرار دیدے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ میں اہواز کی ولایت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے ایسے حدود و امثال تعلیم کیجیے جس سے قربِ خدا و رسولؐ کی راہیں معلوم کر سکوں۔ شاید خدا مجھے اس بلا سے نجات دیدے۔ آپ تو اللہ کی حجت اور اس کے دین کے امانتدار ہیں۔ آپ پر اس کی مسلسل نعمتیں ہیں" حضرت نے فوری طور پر یہ جواب مرحمت فرمایا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ تم پر اپنا لطف و کرم فرمائے تم کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ میں تمھارے لئے ایک مختصر ہدایت نامہ لکھتا ہوں۔ اس پر عمل کرو گے تو سلامتی پاؤ گے۔ مجھے میرے پدر بزرگوار نے اپنے آبا و کرام کے واسطے سے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد بتایا ہے کہ جس نے مردِ مومن کو صحیح مشورہ نہ دیا اس کی عقل سلب ہو جائے گی۔ یاد رکھو، تمھاری نجات اسی بات میں ہے کہ خون کی حفاظت کرو۔ اولیاءِ خدا کو اذیت نہ دو۔ رعایا پر نرمی کرو۔ معاشرت کا انداز اچھا رکھو۔ نرمی کرو لیکن ضعف کے ساتھ نہیں۔ سختی کرو لیکن تشدد کے انداز سے نہیں۔ اپنے ساتھیوں اور آنے والوں سے مدارات کا سلوک کرو۔ حق و عدل کے معاملات میں رعایا کا ساتھ دو۔ دیکھو چغل خوروں اور افترا پردازوں سے بچتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں لغزش میں مبتلا کر دیں اور تم ان کی باتوں میں آ جاؤ۔ ایسا کرو گے تو پروردگار ناراض ہو جائے گا اور تمھاری عزت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اپنے اسرار و رموز کو اس شخص کے حوالہ کرو جو دین میں

ہم خیال، امانت دار اور آزمایا ہوا ہو۔ اگر کوئی درہم، کوئی خلعت یا کوئی سواری غیر راہِ خدا میں کسی شاعر یا مسخرے کو دینا تو اتنا ہی راہِ خدا میں بھی صرف کرنا۔ اپنے عطیے اور انعامات سپاہیوں، قاصدوں، سفیروں اور فوجیوں کے لئے رکھو۔ نیکیاں۔ صدقات، آب وطعام، ہدایا، رقوم حج وغیرہ اپنے پاکیزہ ترین کسب سے نکالو۔ سونے چاندی کا ذخیرہ نہ رکھو۔ ایسے لوگوں کے لئے قرآن نے عذاب الیم کی بشارت دی ہے۔ جو طعام راہِ خدا میں دو اسے کم نہ سمجھو، اس سے غضبِ الٰہی سے نجات ملتی ہے۔ میں نے اپنے آباء و اجداد کے واسطے سے رسولؐ اکرم کا یہ ارشاد سنا ہے کہ جس کا ہمسایہ بھوکا رہے اور وہ سیر ہو کر سو جائے وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔

امیرالمومنینؑ نے یمن کر عرض کیا تھا کہ اس طرح تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے ـــــ فرمایا ــــ کہ یہ بات اپنی ضرورت سے فاضل آب و دانہ اور لباس و خلعت کے لئے ہے۔

چنانچہ امیرالمومنینؑ دنیا سے اس عالم میں گئے کہ آپ کے ذمہ کوئی بار نہ تھا اور نہ کوئی قابلِ ملامت بات آپ کی زندگی میں پیدا ہو سکی۔ آپ کے بعد ائمۂ ہدیٰ نے یہی سیرت اختیار کی اور کبھی اپنے کردار کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ عبداللہ دیکھو کسی مومن کو دھمکانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے کہ مومن کی طرف نگاہِ تند سے دیکھنے والا بھی روزِ قیامت سایۂ رحمتِ الٰہی سے محروم رہے گا۔ اسے دیمک کی شکل میں محشور کیا جائے گا یہاں تک واردِ جہنم ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نے مقامِ اخلاق اور اموالِ حکومت کے متعلق قوانین تحریر فرمائے جس پر عمل کرنے والا یقیناً نجات یافتہ ہو سکتا ہے۔ (بحار ۱۷/۲۶۳، وسائل باب الولایہ)

ایک شخص اہواز سے حضرت کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ میرے ذمہ عبداللہ نجاشی کا کچھ خراج باقی ہے۔ آپ ایک سفارشی خط لکھ دیجئے۔ آپ نے صرف ایک کلمہ تحریر فرمایا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اپنے بھائی کو خوش کرو اللہ تمھیں خوش کرے گا۔" نجاشی نے خط دیکھتے ہی آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے خراج کو معاف کر دیا اور اس سے دریافت کیا کہ میں نے تمھیں خوش کر دیا؟ اس نے عرض کی۔ جی ہاں!

صفاتِ الٰہیہ

عبدالملک بن اعین نے آپ کے نام عراق سے ایک خط لکھا کہ یہاں کچھ لوگ خدا کی شکل وصورت اور اس کے نقش ونگار معین کرتے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں صحیح راستہ کی ہدایت فرمائیں ۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا۔ تم نے توحید کے بارے میں اور اپنے ہم وطن لوگوں کے عقیدہ کے بارے میں دریافت کیا ہے تو یاد رکھو کہ خدا بلند و بالا اور بے مثل ہے۔ وہ سمیع وبصیر ہے۔ اس کو مخلوق سے تشبیہ دینے والے افترا پرداز اور غلط گو ہیں ۔ یاد رکھو کہ توحید کے بارے میں صحیح عقیدہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اللہ کو کسی کی شبیہ نہ بناؤ اور نہ اس کے احکام کو بالکل الگ تصور کرو۔ وہ ثابت وموجود ہے لیکن دنیا کے وصف کرنے والوں سے اجل وارفع ہے۔ دیکھو! قرآن سے تجاوز نہ کرو ورنہ ایمان کے بعد بھی گمراہ ہو جاؤ گے ۔(کافی ا ص۱۰۰)

اصحاب کے نام

" اللہ سے ڈرو اور خیر کے علاوہ زبان بند رکھو! آخرت میں کام آنے والی باتوں کے علاوہ سکوت اختیار کرو۔ ذکر خدا اور تسبیح وتہلیل میں زیادتی کرو۔ اس سے دعائیں مانگو۔ وہ سب سے بلند ہے۔ اس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ حرف باطل سے اپنی زبانوں کو محفوظ رکھو تاکہ جہنم سے بچے رہو اس لئے کہ ایسی باتوں سے انسان اگر توبہ نہ کرے تو جہنم کا اندیشہ ہے۔"

" اپنے پروردگار سے عافیت مانگو، سکون سے رہو، نیک کرداروں کی طرح پاک وپاکیزہ رہو، مسلمان مسکینوں کا خیال رکھو۔ ان کو حقیر سمجھنا دین میں لغزش کا سبب ہے ۔مسلمان کی توہین کرنے والا عذابِ خدا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرنا۔ یہ صالحین کا شعار نہیں ہے۔ ایسا کرنے والا خود بھی مظالم میں مبتلا ہوگا اور اللہ اس کا ساتھ نہ دے گا پھر

وہ مظالم کا شکار ہی رہے گا۔ آپس میں حسد نہ کرو۔ حسد کفر کی بنیاد ہے۔ مظلوم مسلمان کے خلاف ظالم کی اعانت نہ کرو ورنہ اس کی دعا قبول ہو کر رہے گی۔ حرام چیزوں کی طرف رغبت نہ کرو کہ اللہ کے محرمات کی توہین کرنے والا جنت سے محروم رہے گا۔"

نصائح

تاریخی اعتبار سے یہ بات کسی طرح بھی تعجب خیز نہیں ہے کہ اہلبیتؑ کی علمی شہرت، ان کی قوت استدلال اور ان کے طرز ہدایت کے استحکام کی بنا پر امت کے بڑے بڑے علماء ان سے استفادہ کو بے حد غنیمت شمار کیا کرتے تھے۔

امام صادقؑ اس گھرانہ کے اہم ترین اور اپنے دور کے کامل ترین فرد تھے اس لئے ان کے گرد امت کا اجتماع ایک فطری امر تھا۔ امت یہ چاہتی تھی کہ آلِ رسولؐ سے ہدایت — تاکہ ان کے مقرر کئے ہوئے خطوط پر چل کر نجات پا —

سفیان ثوری برابر کے حاضری دینے والے تھے۔ ابو حنیفہ باریابی کو غنیمت شمار کرتے تھے اور کوفہ میں امام کی خدمت میں شرفیابی ان کا مستقل شعار تھا۔ مالک آپ کے مواعظِ حسنہ سے برابر مستفید ہوتے رہتے تھے۔ سفیان ثوری نے تو ان نصائح کو منظور بھی کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے حکومت نے انھیں اپنی طرف موڑنے کی کوشش کی اور جب ناکام ہو گئی تو ان پر شاہی عتاب نازل ہو گیا۔

حفص بن غیاث آپ کے مواعظ کو مشعلِ راہ بناتے تھے اور اسے آیندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ انھیں حضرت نے درج ذیل نصیحت فرمائی تھی۔

"اگر ممکن ہو تو لوگوں میں غیر معروف ہو جاؤ۔ اس لئے کہ لوگوں میں شہرت کا نہ ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ پھر کوئی اللہ کی نظر میں قابلِ تعریف ہو تو لوگوں کی مذمت سے کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر گھر میں بیٹھنا ممکن ہو تو باہر نہ نکلو اس لئے کہ باہر نکلنے کی ذمہ داری یہ ہے کہ غیبت نہ کرو جھوٹ نہ بولو، حسد نہ کرو، ریاکاری نہ کرو، تصنع نہ برتو، سستی نہ کرو۔ (وسائل باب الجہاد ۲۶)

سفیان ثوری کو نصیحت :۔

"شبہات میں توقف کرنا ہلاکتوں میں گر پڑنے سے زیادہ بہتر ہے۔ بغیر سمجھے روایت بیان کرنے سے روایت نہ کرنا ہی اچھا ہے۔ ہر حق پر ایک حقیقت اور ہر صداقت پر ایک نور ہے۔ لہذا جو بات کتابِ خدا کے موافق ہو اسے لے لو ورنہ ترک کر دو۔" (تاریخ یعقوبی ج۲ ص۱۱۵)

نصر بن کثیر راوی ہیں کہ میں سفیان ثوری کے ساتھ حضرت جعفرؑ بن محمدؑ کے پاس گیا اور میں نے عرض کی کہ میرا ارادہ حج کے لئے ہے۔ آپ مجھے کوئی دعا تعلیم فرمائیں۔ آپ نے یہ دعا تعلیم کی "یَا سَابِقَ الْفَوْتِ یَا سَامِعَ الصَّوْتِ یَا کَاسِیَ الْعِظَامِ لَحْمًا بَعْدَ الْمَوْتِ"۔ خانۂ کعبہ کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر یہ فقرے ادا کرو اور پھر جو چاہو مانگو۔ اتنے میں سفیان نے کوئی بات کہی جو میں سمجھ نہ سکا۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جب کوئی محبوب شے ملے تو حمد خدا کرو اور جب کوئی ناپسندیدہ بات رونما ہو تو لاحول پڑھو اور جب رزق ملنے میں تاخیر ہو تو استغفار کیا کرو۔"

ایک اور موقع پر سفیان نے حضرت سے مل کر درخواست کی کہ آپ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا "جھوٹے کے لئے کوئی مروت نہیں ہے، زود رنج کا کوئی بھائی نہیں ہے، حاسد کے لئے راحت نہیں ہے۔ بدخلق کے لئے سیادت و ریاست نہیں ہے۔

سفیان نے عرض کی حضور کچھ اور، فرمایا "سفیان! خدا پر بھروسہ رکھو تاکہ مومن رہو۔ اس کی عطا پر راضی رہو تاکہ غنی کہلاؤ۔ ساتھیوں سے اچھا برتاؤ کرو تاکہ مسلمان رہ سکو۔ فاجر کا ساتھ نہ رکھو کہ وہ فجور سکھائے گا۔ اپنے امور میں خداترس لوگوں سے مشورہ کرو۔"

سفیان نے پھر درخواست کی۔ کچھ اور؟ فرمایا "جو شخص بلا قبیلہ کی عزت، بلا مال کی مالداری، بلا سلطنت کی ہیبت چاہتا ہے وہ معصیت کی ذلت سے اطاعت کی عزت میں آجائے۔"

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سفیان نے آکر حضرت سے عرض کی کہ جب تک حضور حدیث نہ بیان فرمائیں گے میں نہ جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ میں حدیث تو بیان کئے دیتا ہوں لیکن زیادہ احادیث میں تمہارے لئے بہتری نہیں ہے۔ دیکھو اگر کسی بھی نعمت کی بقا و دوام چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ شکر خدا کرو ——— کہ شکریہ پر اضافہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر رزق میں تاخیر

ہو جائے تو استغفار کرو اس لئے کہ قرآن نے استغفار پر آسمان سے نعمتوں کے نزول اور زمین سے باغ و بہار، اموال و اولاد اور اشجار و انہار کا وعدہ کیا ہے۔ دیکھو اگر کسی کی طرف سے کوئی رنج پہنچے تو لاحول پڑھا کرو۔ یہی کشائش حال کی کنجی اور جنت کا خزانہ ہے۔ سفیان نے یہ سنا تو بار بار انگلیوں پر گن گن کے کہنے لگے۔ واہ کیا تین باتیں ہیں ـــــ تین باتیں ـــــ تین۔ سبحان اللہ۔
(حلیۃ الاولیاء ۳ صہ ۱۹۳ بروایت مالک بن انس)

عبداللہ بن جندب کو نصیحت

"ابن جندب! مومن وہی ہے جو اللہ کا خوف رکھے، ملی ہوئی توفیق کے سلب ہو جانے سے ڈرے، نعمت خدا کا ذکر آئے تو کانپ اٹھے۔ آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہو تو ایمان میں اضافہ ہو اور پھر اللہ پر اعتماد بھی رکھے۔

ابن جندب! صرف اپنے عمل پر بھروسہ کرنے والا ہلاک ہوگا۔ گناہوں پر جرأت کر کے رحمت کی امید کرنے والے کو نجات نہیں ہے۔"

عبداللہ نے عرض کی "حضور! نجات کس کے لئے ہے؟"

فرمایا "وہ لوگ جو امید و بیم کی درمیانی کیفیت میں رہتے ہیں۔ جن کے دل اس طائر کے پنجہ میں رہتے ہیں جو شوقِ ثواب اور خوفِ عقاب کے بل بوتے پر پرواز کرتا ہے افسوس ان لوگوں پر ہے جو نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔ تنہائی میں سوتے رہتے ہیں۔ فراغت کے وقت میں اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور نہ اللہ روزِ قیامت ان سے بات ہی کرے گا۔"

"ابن جندب! اپنی محبت و عداوت سب اللہ کے لئے رکھو۔ ریسمانِ ہدایت سے تمسک کرو تاکہ تمھارے اعمال قبول ہو سکیں۔ آخرت میں اپنا حصہ لو۔ دولت مل جائے تو غرور نہ کرو۔ فقیری میں فریادی نہ بنو، بد سرشتی نہ اختیار کرو کہ لوگ تم سے دور بھاگنے لگیں۔ خرافات مت بکو کہ لوگ ذلیل سمجھیں۔ اپنے سے بڑے کا عیب مت نکالو۔ چھوٹے کا مذاق نہ اڑاؤ۔ اہلِ امر سے

جھگڑا نہ کرو۔ بیوقوفوں کی اطاعت نہ کرو۔

ابن جندب! جو تم سے بے تعلقی رکھے تم اس سے تعلقات قائم کرو۔ جو تمہیں محروم کر دے تم اسے عطا کرو۔ جو تم سے برائی کرے تم اس سے اچھائی کرو۔ جو تمہیں گالی دے تم اسے سلام کرو۔ جو تم سے جھگڑا کرے تم اس سے انصاف کرو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کر دو۔ اس لئے کہ یہی بات تم اپنے لئے چاہتے ہو۔

ابن جندب! لوگوں کے سامنے صدقہ نہ دو کہ وہ تمہاری تعریف کریں ورنہ وہ تعریف ہی تمہارا اجر بن جائے گی۔ داہنے ہاتھ سے اس طرح دو کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو اس لئے کہ جس کے لئے کر رہے ہو وہ نیت سے باخبر ہے اور جزا علی الاعلان دیتا ہے۔ (تحف العقول ص۳۰۳-۳۰۵)

بعض اصحاب کو نصیحت

"بے معنی بات مت کرو، بامقصد گفتگو بھی بے محل کرنے والا اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ کسی عقلمند یا احمق سے جھگڑا نہ کرو کہ عقلمند سے جھگڑا اس کی دوری کا سبب ہوتا ہے اور بیوقوف سے جدال اس کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ برادر مومن کو غائبانہ طور پر اس طرح یاد کرو جیسے اپنا تذکرہ پسند کرتے ہو۔ عمل اس آدمی جیسا کرو جو نیکی کی جزا اور برائی کی سزا کا قائل ہو۔"

اس کے علاوہ اہلبیت طاہرین کے بے شمار ارشادات ہیں جن میں انسان کی تطہیر نفس، تزکیہ جذبات، اجتناب شہوات اور احتراز لذات کا مکمل دستور مرتب کیا گیا ہے۔ ان پر عمل کرنے والے کے لئے نجات و رشد و ہدایت کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ انداز بیان ایسا شیریں ہے کہ گویا تلخ و تند موعظہ میں بھی کانوں میں رس گھولا جا رہا ہے۔

کلماتِ قصار

"اللہ سے ڈرو۔ آپس میں نیک کردار بھائی بنو۔ اللہ کے لئے محبت کرو۔ تعلقات رکھو۔

ایک دوسرے پر رحم کرو۔ ملاقات کرو اور آمد و رفت جاری رکھو۔"

"ظلم سے بچو ——— کہ مظلوم کی دعا آسمان تک جاتی ہے۔

"جسے مسلمانوں کے امور کی فکر نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص بھی صبح اٹھ کر امور مسلمین کا اہتمام نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہے، جو کسی کو مسلمان کے نام سے فریاد کرتے سنے اور لبیک نہ کہے وہ بھی مسلمان نہیں ہے۔"

"اللہ کی نظر میں محبوب صدقہ لوگوں کے درمیان اصلاح کرنا اور ان کی باہمی دوری کو قربت سے بدلنا ہے۔"

"مومن وہی ہے جس کا کسب پاکیزہ، اخلاق اچھا اور باطن صحیح ہو۔ ضرورت سے زیادہ مال کو راہِ خدا میں خرچ کر دے، بلا ضرورت کلام نہ کرے، لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں اور وہ لوگوں سے از خود انصاف کرے۔"

"مومن وہ ہے جو ہر ایک کی مدد کرے، اپنا خرچ کم رکھے، معاش کی اچھی تدبیر کرے اور ایک جگہ سے دو مرتبہ دھوکا نہ کھائے۔"

"اپنے کام اللہ کے لئے کرو، لوگوں کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ جو اللہ کے لئے ہوتا ہے وہ اللہ تک پہنچتا ہے اور جو بندوں کے لئے ہوتا ہے وہ اس تک نہیں پہنچتا ہے۔"

"ریاست کے شوقین لوگوں سے بچو۔ اس لئے کہ جس کے پیچھے چار آدمی چلیں وہ خود بھی ہلاک ہوگا اور دوسروں کو بھی تباہ کرے گا۔"

"کسی عقلمند یا بیوقوف سے جھگڑا نہ کرو کہ عقلمند تم سے نفرت کرے گا اور بیوقوف تم کو اذیت پہنچائے گا۔"

"خصومت سے بچو یہ دل کو مشغول کر لیتی ہے اور کردار میں نفاق پیدا کرتی ہے۔ جو عداوت کا بیج بوئے گا اور اسے وہی کاٹنا بھی پڑے گا۔ اور جو اپنے نفس پر قابو نہ رکھے گا، اسے عقل پر بھی قابو نہیں ہو سکتا ہے۔"

"غصہ سے بدتر کوئی شے نہیں ہے، غضب ناک آدمی نفس محترم کو قتل کر دیتا ہے اور آبرومند کو عیب لگاتا ہے۔"

خطرہ محسوس کرو۔"

"جب تمھیں کسی بھائی کی طرف سے کوئی بری خبر ملے تو غمگین نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ صحیح کہتا ہے تو گویا تمھیں اپنے فعل کی سزا مل گئی اور اگر غلط کہتا ہے تو تمھیں مفت کا ثواب مل گیا۔"

"نیکی تین باتوں سے مکمل ہوتی ہے۔ جلدی کرے، کم سمجھے، پوشیدہ رکھے۔"

"انسان کی فطری خصلتوں میں نہ جھوٹ داخل ہے اور نہ خیانت۔"

"تین چیزوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ دین، تواضع، خرچ۔"

"جو تین باتوں سے بچے گا اسے تین چیزیں ملیں گی۔ شر سے بچا تو عزت پائے گا، تکبر سے بچا تو بزرگی ملے گی، بخل سے بچا تو باشرف ہوگا۔"

"تین چیزوں سے بغض پیدا ہوتا ہے۔ نفاق، خود پسندی، ظلم۔"

"دین کی آفتیں۔ حسد، خود پسندی، فخر۔"

"مومن ترقی کی خواہش کر سکتا ہے، دوسرے کی ترقی سے جل نہیں سکتا ہے۔"

"اللہ سے ڈرو اور انصاف کرو۔ اس لئے کہ نا انصافی کو ناپسند کرتے ہو۔"

"جس امت نے قوی کے مقابلہ میں ضعیف کا ساتھ نہیں دیا وہ پاکیزہ و محترم نہیں ہو سکتی ہے۔"

"اس قوم پر افسوس ہے جو نیکیوں کا حکم نہیں دیتی ہے اور برائیوں سے منع نہیں کرتی ہے۔"

"تین چیزیں بلندیوں کی طلب سے روک دیتی ہیں۔ کم ہمتی، بے حیائی، کمزور رائے۔"

"تین چیزوں سے پرہیز کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ بروں کا ساتھ، عورتوں سے بات چیت، بدعتیوں کے ساتھ نشست و برخاست۔"

"تین چیزوں کی احتیاج تمام دنیا کو ہے۔ امن، عدل، خوشحالی۔"

"تین چیزوں سے زندگی خراب ہوتی ہے۔ ظالم بادشاہ، برا ہمسایہ، بدزبان عورت۔"

"باہمی تعلقات اور حسن ہمسایہ ملک کی آبادی اور عمر کی زیادتی کے باعث ہوتے ہیں۔"

"جو ہمسایہ سے اچھا سلوک نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے۔"

"جسے تین چیزیں مل گئیں وہ سب سے بڑا مالدار ہے۔ اپنے مال پر قناعت، دوسروں

کے مال سے مایوسی، فضول باتوں سے علیحدگی۔"

"جو انجام پر نظر نہ رکھے وہ عقل مند نہیں ہے۔ انجام بینی عقلوں کی پرورش کا ذریعہ ہے۔"

"جب کسی آدمی کو اپنے گناہوں سے غافل ہوکر دوسروں کے عیب تلاش کرتے دیکھو تو سمجھو کہ اس سے انتقام ہوگیا۔"

"اپنے نفس کو مضرت رساں مواقع سے بچاؤ۔ طلب معاش کی طرح اس کو بچانے کی فکر کرو اس لئے کہ تمہارا نفس تمہارے عمل میں گرفتار ہے۔"

"اللہ سے دن رات کے حملوں سے پناہ مانگو یعنی عذاب الٰہی اور گناہوں پر مواخذہ سے بچو۔"

"بیوقوف سے مشورہ نہ کرو۔ وہ بلاوجہ پریشان بھی ہوگا اور کام بھی نہ ہوگا۔ جھوٹے سے مدد نہ مانگو، وہ دور کو قریب اور قریب کو زبردستی دور بنا دے گا۔ بادشاہوں کی محبت پر بھروسہ نہ کرو، وہ عین اعتماد کے موقع پر ساتھ نہ دیں گے اور خاص تعلقات کے وقت پر الگ ہوجائیں گے۔"

"بادشاہ کے پاس تین طبقے ہوتے ہیں۔ ایک خیر کا موافق ہوتا ہے، یہ اس کے لئے برکت ہوتا ہے۔ ایک کا ہم آہنگ ہوتا ہے، یہ اس کے لئے عذاب ہوتا ہے۔ ایک کو اپنے کام سے کام ہوتا ہے، یہ ایسی کے کام آسکتا ہے اور نہ اس کے حق میں مذموم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مذمت سے قریب ضرور ہے۔"

"شہر والے تین چیزوں کے بغیر منظم نہیں ہوسکتے ہیں۔ فقیہ محتاط، امیر خیر، طبیب حاذق و معتبر۔"

"بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ دو تو جان و مال سے ساتھ دیتے ہیں، یہ سچے بھائی ہیں۔ اور ایک مال لے لیتا ہے کام نہیں کرتا، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔"

"بہترین مددگار حلم اور برداشت ہے۔"

"جس نے غصّہ کو ضبط کیا وہ دنیا و آخرت میں عزت والا ہے۔"

"مومن کے لئے فرائض کے بعد اللہ کی نظر میں محبوب ترین شے وسعتِ اخلاق ہے۔"

"اچھا سلوک اور خوش روئی محبت کی موجد اور جنت میں داخلہ کی باعث ہے۔"

"عداوت بونے والا عداوت ہی کاٹ سکتا ہے۔"

"خود پسندی کا شکار ہلاک ہوگا۔"

"حیرت اس انسان پر ہے جو اپنے عمل پر خوش ہوتا ہے حالانکہ انجام سے بے خبر ہے۔"

"غرور کرنے والا اور جبر سے کام لینے والا باطنی طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے۔"

"جب زمانہ ظلم کا ہو اور لوگ غداری پر آمادہ ہوں تو ہر کسی پر بھروسہ کرنا عاجزی ہے۔"

"اگر بھائی کی محبت کو آزمانا ہو تو اسے غصہ دلادو۔ اگر محبت رہ جائے تو وہ بھائی ہے ورنہ سب مکاری ہے۔"

"اپنے بھائی پر پورا پورا بھروسہ نہ کرو کہ جلدی کی لغزش سے سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔

"مسلمانوں کا سچا یقین یہ ہے کہ اللہ کو ناخوش کرکے بندوں کو خوش نہ کرے۔ جو اللہ نے اسے نہیں دیا اس پر دوسروں کی ملامت نہ کرے، اس لئے کہ رزق نہ کسی لالچ سے آتا ہے اور نہ کسی نفرت سے جاسکتا ہے۔"

"اللہ سے یوں ڈرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھتے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے اور اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ تمھیں نہیں دیکھتا ہے تو یہ کفر ہے۔ اور اگر یہ خیال ہے کہ وہ دیکھتا ہے لیکن ہم گناہ کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"جس گھر والوں کو نرمی ملی اسے وسعتِ رزق بھی ملے گی۔ اس لئے کہ نرمی سے کچھ کمی نہیں آتی ہے اور اسراف سے کچھ باقی نہیں رہتا ہے۔"

"علم حاصل کرو اور اسی کے ساتھ حلم و وقار پیدا کرو۔ جابر عالم نہ بنو کہ تمھارے باطل کے ساتھ حق بھی برباد ہوجائے۔"

"مومن وہی ہے جو غصہ میں حق سے الگ نہ ہو اور خوشی میں باطل میں داخل نہ ہو۔"

"اللہ سے ڈرو اور باہمی حسد سے بچو۔"

"بکریوں کے لئے دو بھیڑیئے اتنے خطرناک نہیں ہیں جتنی دینِ مسلم کے لئے مال اور شرف کی محبت خطرناک ہے۔"

"قیامت کے دن تین قسم کے لوگ اللہ سے بے حد قریب ہوں گے۔ ایک وہ جو اقتدار پاکر بھی کمزور پر ظلم نہ کرے، دوسرے وہ جو دو آدمیوں کے بیچ میں رہے تو کسی پر دباؤ نہ ڈالے، تیسرے وہ جو ہمیشہ حق کہے چاہے اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو۔"

"بر خود غلط آدمی کی تین علامتیں ہیں۔ اپنے مافوق سے جھگڑا، بے سمجھے بوجھے گفتگو اور ناممکن کوشش۔"

"دو کمزور مخلوق یتیم اور عورت کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔"

"مفضل! دو باتیں یاد رکھو اور ان سے بچو۔ انھیں سے لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ باطل کو دین نہ بناؤ۔ بغیر علم کے فتویٰ نہ دو۔"

"متکبر کو اچھی تعریف، بخیل کو کثرتِ احباب، بدخلق کو شرف، کنجوس کو صلۂ رحم، مسخرے کو سچی محبت، کم علم کو شرعی قضاوت، غیبت شعار کو سلامتی، حاسد کو اطمینانِ قلب، چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر گرفت کرنے والے کو سرداری اور ناتجربہ کار خود پسند کو ریاست کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔"

"بیوقوفی وہ ذلیل صفت ہے جس میں چھوٹے پر زیادتی، بڑے پر خضوع اور کثرت سے معذرت کا وجود عمل میں آتا ہے۔"

"فطرت انسانی یہ ہے کہ احسان کرنے والے سے محبت اور برائی کرنے والے سے نفرت کرے۔"

"جو تم پر تین مرتبہ غضب ناک ہو اور کوئی بری بات نہ کہے اسے دوست سمجھو اور جسے دوست رکھنا ہے اس سے جھگڑا، مذاق اور جھوٹا وعدہ نہ کرو۔"

"پانچ قسم کے آدمیوں کے ساتھ نہ رہو۔ احمق۔ کہ وہ فائدہ کی کوشش میں نقصان پہنچائے گا۔ جھوٹا۔ کہ وہ ایک سراب ہے جو دور کو قریب اور قریب کو دور بتاتا رہے گا۔ فاسق۔ کہ وہ تمھیں ایک لقمہ میں بیچ دے گا۔ بخیل۔ کہ وہ ضرورت کے وقت ساتھ چھوڑ دے گا۔ بزدل۔ کہ وہ تمھیں دشمن کے سپرد کر دے گا۔"

"تین قسم کے آدمیوں پر رحم واجب ہے۔ مالدار جو فقیر ہو جائے، عزیز قوم جو ذلیل

ہو جائے۔ عالم جسے جاہل کھلونا بنا لیں۔"

"جب اللہ کسی رعیت پر خیر کرتا ہے تو انھیں رحم دل بادشاہ اور عادل وزیر عطا کر دیتا ہے۔"

"مومنین سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک ماں باپ کے بیٹے۔ اس لئے جب ایک رگ پر چوٹ پڑے گی تو دوسری خود بخود پھڑک اٹھے گی۔"

"تنقید عداوت کا باعث ہے، بے صبری رسوائی ہے اور افشائے راز بے اعتباری کا سبب ہے۔"

"نامحرم پر نظر سے بچو۔ نظر دل میں شہوت کا بیج بوتی ہے اور یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ خوش بخت وہ ہے جس کی نظر آنکھ میں نہ ہو بلکہ دل میں ہو۔"

"حفص بن البختری کہتے ہیں کہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ اتنے میں ایک شخص آگیا۔ آپ نے پوچھا تم اسے دوست رکھتے ہو؟ ـــــ میں نے عرض کی جی ہاں! فرمایا۔ کیوں نہ ہو یہ تمھارا دینی بھائی ہے، دشمن کے مقابلہ میں تمھارے کام آئے گا اور رزق اپنا ہی کھائے گا۔"

یہ کلمات اس بے پناہ ذخیرہ کا ایک جزو ہیں جو مختلف کتب و رسائل میں منتشر ہے۔ کاش کوئی ایسا مجاہد پیدا ہو جاتا جو حضرت کے اس ذخیرہ کو یکجا کر کے امّت کے سامنے پیش کر دیتا اور امت یہ دیکھتی کہ آل محمدؐ نے رشد و ہدایت، تبلیغ و ترویج اسلام اور اصلاح قوم کے لئے کیا بیش بہا ذخیرہ مہیّا کیا ہے۔ یہی وہ تعلیمات ہیں جن میں نفس کی اصلاح، جذبات کے تزکیہ اور خواہشات کی تطہیر کا مکمل سامان ہے۔ ان پر عمل کرنے کے بعد ہی انسان سکونِ قلب اور اطمینان نفس کی بے بہا دولت حاصل کر سکتا ہے اور سماج چین کی زندگی گذار سکتا ہے۔

ان اخلاقیات کے علاوہ فقہ و تفسیر و حدیث و کلام کے موضوعات پر آپ کے بیانات وارشادات اس کثرت سے ہیں کہ ہم اشارے کے علاوہ اور کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ علماء عصر نے آپ سے استفادہ کیا ہے اور اربابِ قلم نے اپنے تالیفات میں ان افادات

کو جمع کر دیا ہے۔ اب ان سے فائدہ اٹھانا امت کا کام ہے۔

مصادر بحث

۱۔ کافی	محمد بن یعقوب کلینی	۷۔ خصال	صدوق
۲۔ تحف العقول	ابو محمد حسن بن علی بن شعبہ	۸۔ محاسن	برقی
۳۔ وسائل	محمد بن الحسن الحر العاملی	۹۔ الامام الصادق	مظفر
۴۔ حلیۃ الاولیاء	حافظ ابو نعیم اصفہانی	۱۰۔ الاثنا عشریہ	ابن قاسم حسینی
۵۔ جامع السعادات	نراقی	۱۱۔ بحار الانوار ج ۱۷	مجلسی
۶۔ روضہ	حافظ نیشاپوری	۱۲۔ تذکرہ	ابن حمدون

وغیرہ

امام جعفر صادقؑ
تلامذہ، رواۃ حدیث

امام جعفر صادقؑ کے مدرسۂ فکر کا تذکرہ کرتے ہوئے ان رجالِ فکر اور ابطالِ علم کا نام لینا بھی ضروری ہے جنھوں نے اس مدرسہ میں داخلہ لیا اور اس سے وہ کچھ لے کر نکلے جسے آج امت اسلامیہ اپنی عقلی اور فکری میراث تصور کر رہی ہے۔

اس مدرسہ کی امتیازی صفت یہ تھی کہ اس نے کسی وقت بھی حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور نہ اس کے اشاروں پر چلنا گوارا کیا۔ اس کی نظر میں یہ تمام سیاستیں اسلام کے اس واقعی نظام سے بالکل اجنبی تھیں۔

یہی بات امت کی نیک بختی اور اس کی ہر شعبۂ حیات میں ترقی کی ضمانت تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں حکومت کو اس کی ترقی اور وسعت کی راہ میں ہر اعتبار سے حائل ہونا ہی چاہئے تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ طاقتیں صرف کر دی گئیں۔ رکاوٹیں پیدا کی گئیں لیکن یہ مدرسہ ان تمام سخت ترین حالات کا مقابلہ کر کے آگے ہی بڑھتا گیا اور آج ساری امت کے لئے مشعلِ راہ اور سنگِ میل بن گیا ہے۔

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اموی اور عباسی حکومت کے طرزِ عمل اور اس کے اندازِ مزاحمت میں کافی فرق تھا۔

بنوامیہ اہلبیتؑ سے کھلم کھلا معارض تھے۔ ان کا کام ذکرِ اہلبیتؑ کو مٹانا، ان کے چاہنے والوں کو اذیت دینا اور ان کو امت سے الگ کر دینا تھا۔ وہ ان سے روایت کرنے والوں کو سزائیں دیتے تھے اور ہر اس آدمی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے جو حکومت کے مصالح کی رعایت کرے اور حقوقِ آلِ محمدؐ کی پرواہ نہ کرے۔ چنانچہ اس فہرست میں بھی حسبِ ذیل نام

نمایاں طور پر نظر آتے ہیں :۔

سلیمان بن اشرق۔ اموی غلام جسے مفتی دمشق بنایا گیا۔

عبداللہ بن زکوان۔ راوی ابوہریرہ جسے والی امور حکومت بنایا گیا اور اتنا بلند کیا گیا کہ بقول لیث ۳۰۰ طالب علم اس کے پیچھے چلنے لگے۔

نافع۔ غلام ابن عمر جسے فقیہ وقت مانا گیا جب کہ خود ابن عمر اس سے کہتے تھے کہ میرے خلاف اس طرح روایتیں نہ گڑھنا جس طرح عکرمہ نے ابن عباس کے خلاف روایتیں گڑھی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۷، ص۲۶۷)

سلیمان بن یسار۔ جسے مفتی مدینہ بنایا گیا۔

مکحول غلام بنی ہذیل۔ جسے عالم دمشق بنایا گیا۔

ابو حازم سلمہ بن دینار اعرج غلام بنی مخزوم۔ جسے عالم مدینہ قرار دیا گیا۔

سلیمان بن طرخان، اسماعیل بن خالد بجلی اور عکرمہ جنہیں بڑے بڑے محدثین کا درجہ دیدیا گیا اور عکرمہ کی روایتیں عظیم ترین منزل کی مالک ہوگئیں۔

بنو امیہ نے اپنی غرض کے تابع افراد کو درجات تقسیم کیے اور اپنے کام نہ آنے والوں کو موردِ عتاب ٹھہرایا :۔

سعید بن مسیب متوفی سنہ ۹۳ھ کو صرف اپنی تائید نہ کرنے پر باقاعدہ مرمت کر کے شہر میں تشہیر کرایا۔

ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے اموی دربار میں بلایا گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب خیر نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں اس مسئلہ میں حضرت علیؑ کا ہم خیال تھا۔ لیکن یہ سوچ کر چلا کہ میں حق ہی کہوں گا۔ پھر جو ہونا ہوگا، ہوگا۔ اس لئے کہ بنی امیہ حضرت علیؑ کا نام نہیں سننا چاہتے تھے۔ علماء ان کی حدیثوں کو "قال الشیخ" کے عنوان سے بیان کرتے تھے۔ حسن بصری آپ کی تعبیر "ابوزینب" سے کیا کرتے تھے۔ (مناقب ابوحنیفہ مکی ص۱۷۱)

حسن بصری کا تقیہ اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ وہ حضرت علیؑ کے خلاف بھی کہہ جایا کرتے

تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابان بن عیاش نے اسی بات پر ٹوک دیا تو انھوں نے کہا کہ میں اس طرح ان ظالموں سے اپنے خون کا بچاؤ کیا کرتا ہوں ورنہ اب تک قتل ہوگیا ہوتا۔ (الحسن البصری ابن جوزی صے)

شعبی تو اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمیں آل محمدؐ سے کیا ملا؟ ان سے دوستی کریں تو قتل کئے جائیں۔ دشمنی کریں تو جہنم میں چلے جائیں۔ دونوں صورتوں میں مصیبت ہی مصیبت ہے۔ (عیون الاخبار ابن قتیبہ ص۱۱۲)

بنی امیہ کے دور میں وابستگانِ آلِ محمدؐ اور ان کے علوم سے استفادہ کرنے والوں کے لئے حالات انتہائی ناسازگار تھے لیکن ایک عرصہ کے بعد ان کی حکومت کمزور ہوئی تو لوگوں کو اس ڈیوڑھی تک پہنچنے کا موقع مل گیا اور امام باقرؑ کا ایک ایسا حلقۂ درس قائم ہوگیا کہ مدینہ بھر میں آپ کی حدیث تمام ہونے سے پہلے کسی کے درس کا آغاز نہ ہوتا تھا اور یہی حال مکّہ کا بھی تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حجاز نے ولائے اہلبیتؑ کے طفیل میں ان کے علوم و معارف سے اپنا دامن بھر لیا۔ باقی شہروں کے لوگ بھی مدینہ ہی کے محتاج تھے کہ وہ رسول اکرمؐ کا تبلیغی وطن اور صحابہ کرام کا مرکز تھا۔ چار طرف سے لوگ مدینہ کی طرف آتے تھے اور امام صادقؑ کا دور آتے آتے یہ گھر ایک اسلامیات کی یونیورسٹی بن گیا تھا۔ ۴ ہزار شاگردوں کا ہجوم، درس کی رونق دید کے قابل تھی۔ شاگردوں نے آپ کے بیانات کو اپنی اپنی ڈائری میں محفوظ کیا اور اس طرح چار سو مصنفین کی چار سو کتابیں مرتب ہوگئیں۔ امام صادقؑ کی یہ شہرت اور مرجعیت کوئی قابلِ تعجب یا نئی چیز نہ تھی کہ آپ اپنے دور میں اہلبیتؑ کی نمایاں ترین فرد اور جملہ علمی کمالات کے جامع تھے۔ آپ کے فیوض و برکات کی یہ کیفیت تھی کہ کوفہ میں نو سو شیخ آپ کی روایتیں بیان کیا کرتے تھے! آپ کے خاص خاص شاگردوں نے خاص خاص موضوعات پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں جیسے:۔

۱۔ ابان بن تغلب ربعی ابوسعید کوفی متوفی ۱۴۱ھ صاحب معانی القرآن، القراآت، الاصول علی مذہب الشیعہ (فہرست ابن ندیم ص۳۰۸)

۲۔ علی بن یقطین متوفی ۱۸۲ھ صاحب کتاب ملاحم۔

۳۔ ابوحمزہ ثابت ابن ابی صفیہ ثمالی متوفی ۱۵۰ھ صاحب تفسیر۔ (کشف الظنون ۲ ص۴۴۲، فہرست ابن ندیم ص۵۰)

۴۔ ابوبصیر یحییٰ بن قاسم متوفی ۱۵۰ھ صاحبِ تفسیر (ابن ندیم)
۵۔ علی بن حمزہ کوفی بطائنی صاحبِ کتاب جامع ابواب فقہ (نجاشی)
۶۔ اسماعیل بن خالد محمد بن مہاجر صاحبِ کتاب القضاء (شیخ طوسی)
۷۔ مفضل بن عمر صاحبِ کتاب توحید ــــ اس کتاب میں امام صادقؑ کا وہ مناظرہ درج ہے جو آپ نے ایک طبیب سے توحید کے بارے میں فرمایا تھا۔ اس میں عالم کی کیفیت، اس کے اجزائے ترکیبیہ، تخلیق انسان، کیفیت ولادت وغذا وطبیعت وفطرت، دماغ اور اس کی عظمت، اعضاء کی ساخت، اس کی حکمت وقدرت، دل، خون، رگ، اعصاب، قوتِ جاذبہ وماسکہ وہاضمہ ودافعہ، ترکیب بدن، تنظیم اعضاء، درستی قامت، اعمال واسرارِ حواس، ہوا، فضا، موت، کلام، منطق، کتابت، علم، معرفت، بصیرت اور ان تمام اشیاء کا ذکر موجود ہے جو حیاتِ انسانی کے لئے لازم ہیں۔
۸۔ ہشام بن الحکم متوفی ۱۸۵ھ صاحبِ کتاب "الامام" "حدوث الاشیاء" "الرد علی الزنادقہ" "الالف"۔ یہ امام کاظمؑ وصادقؑ دونوں کے شاگرد تھے۔ ابن ندیم نے ان کی ۲۵ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (فہرست ص۲۵۰)
۹۔ ابوجعفر احول محمد بن نعمان مومن طاق۔ آپ امام جعفرؑ کے خاص شاگرد تھے۔ علم کلام میں بے مثل ونظیر تھے۔ ایک چھتہ میں بیٹھ کر دشمنوں سے بحث کیا کرتے تھے اور ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اسی لئے دشمن آپ کو "شیطانِ طاق" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ آپ کی تالیفات میں "کتاب الامامت" "کتاب المعرفۃ" "الرد علی المعتزلہ" "کتاب فی امر طلحہ والزبیر" ہے۔ (فہرست ابن ندیم ص۲۵۰)

ان کے علاوہ بہت سے اصحاب ہیں جنھوں نے مختلف علوم وفنون میں اپنی تالیفات کا ایک ذخیرہ چھوڑا ہے اور جن کا تذکرہ آیندہ جلدوں میں مناسب موقع ومحل سے ہوتا رہے گا۔ اس وقت زیر بحث وہ اصحاب ہیں جنھوں نے حضرت سے حدیثوں کی روایت کی ہے اور امت اسلامیہ کے ہر راستہ میں ہدایت کی مشعلیں روشن کی ہیں۔ ایسے حضرات کی مکمل فہرست مرتب کرنے کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی لیکن ہم اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف

ان حضرات کا تذکرہ کریں گے جنھوں نے علم حدیث میں شہرت پائی ہے اور جن کی حدیثوں کو اصحاب صحاح ستہ نے اپنی صحیح کتابوں میں جگہ دی ہے۔

تلامذہ

۱۔ ابراہیم بن سعد بن عبدالرحمٰن زہری متوفی ۱۸۳ھ۔ اپنے وقت کے مرجع اور اصحاب صحاح میں سے ہیں۔ آپ سے یزید بن ہارون، احمد بن حنبل وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن معین۔ ابوحاتم۔ عجلی۔ احمد بن حنبل نے آپ کی توثیق کی ہے۔ تہذیب اور کافی میں آپ کی روایتیں یعقوب کے واسطے سے نقل ہوئی ہیں

۲۔ ابراہیم بن زیاد بغدادی متوفی ۲۲۸ھ۔ آپ کی روایتیں مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کی ہیں۔

۳۔ ابراہیم بن محمد بن یحییٰ الاسلمی ابواسحاق مدنی متوفی ۱۹۱ھ۔

۴۔ ابراہیم بن طہمان بن شعیب ہروی متوفی ۱۶۸ھ۔ صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں۔ احمد ابوداؤد۔ ابوحاتم نے آپ کی توثیق کی ہے۔

۵۔ ابراہیم بن علی بن حسن بن رافع مدنی۔ آپ سے احمد بن محمد۔ ابراہیم بن منذر۔ یعقوب بن حمید نے روایت کی ہے اور ابن ماجہ نے اسے درج کیا ہے۔

۶۔ ابراہیم بن مہاجر ازدی۔ آپ سے حفص بن راشد وغیرہ نے روایت کی ہے جس کا ذکر خطیب نے متفق میں کیا ہے۔

۷۔ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ متوفی ۱۸۴ھ۔ آپ سے شافعی نے روایت کی ہے اور انھوں نے بھی توثیق کی ہے۔ ابن حنبل کے نزدیک ناقابلِ قبول ہیں لیکن ابن عقدہ اور ابن عدی کی نظر میں روایت کے اعتبار سے ٹھیک ہیں بلکہ بعض علماء عامہ کا خیال ہے کہ واقدی کی ساری کتابیں انھیں کی ہیں۔

۸۔ بسام بن عبداللہ صیرفی ابوالحسن کوفی۔ احمد اور یحییٰ بن معین نے توثیق کی ہے۔ نسائی

نے روایت نقل کی ہے اور ابن حجر نے صدوق کہا ہے۔

۹۔ بشار بن قیراط نیشاپوری۔ آپ سے عبداللہ بن ولید بن مہران۔ عمر بن رافع۔ نوح بن انس نے روایت کی ہے اور ابن عدی نے اصحاب رائے میں شمار کیا ہے۔

۱۰۔ بشار بن میمون خراسانی متوفی ۱۸۰ھ۔ مکہ کے ساکن تھے پھر بغداد آئے اور امام صادق سے روایت کی۔ اس کی سزا میں سیاست شعار لوگوں نے آپ کی روایت کو ترک کر دیا۔

۱۱۔ تلید بن سلیمان محاربی کوفی اعرج متوفی ۱۹۰ھ۔ آپ سے ابن حنبل، اسحاق بن موسیٰ وغیرہ نے روایت کی ہے اور ترمذی نے اسے نقل کیا ہے۔ ابن عقدہ نے آپ کے حالات میں امام صادق کی پوری تالیف کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۔ الجراح بن ملیح رواسی کوفی متوفی ۱۷۵ھ۔ آپ سے آپ کے فرزند۔ ابو قتیبہ سفیان بن عقبہ اور ابن مہدی نے روایت کی ہے۔ ابن سعد نے ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔ بخاری نے الادب المفرد میں اور مسلم و ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ نے اپنی کتابوں میں یہ روایتیں نقل کی ہیں۔ ابو احمد بن عدی نے آپ کے روایات کو مستقیم مانا ہے اور آپ کو سچا تسلیم کیا ہے۔ اس لئے آپ سے روایت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۱۳۔ جریر بن عبدالحمید بن قرط قاضی متوفی ۱۸۸ھ۔ آپ سے ابن راہویہ، فرزندان ابی شیبہ۔ یحییٰ بن معین۔ موسیٰ قطان۔ محمد بن قدامہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ عجلی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ نسائی۔ ابوالقاسم اور ابن حجر نے تقریب میں توثیق کی ہے۔

۱۴۔ حبیب بن نعمان اسدی۔ ابن حجر نے مقبول قرار دیا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے۔ ابوداؤد و ابن ماجہ نے روایتیں درج کی ہیں۔

۱۵۔ حسن بن عیاش بن سالم اسدی کوفی متوفی ۱۷۲ھ۔ ابن مہدی اور احمد بن یونس نے روایت کی ہے۔ ابن معین و نسائی و ابن حبان نے توثیق کی ہے اور مسلم و ترمذی و نسائی نے روایت کو اپنی صحاح میں جگہ دی ہے۔

۱۶۔ حکم بن عتبہ کندی متوفی ۱۱۳ھ۔ رجال صحاح ستہ میں ہیں اور اعمش، منصور۔ ابو اسحاق شیبانی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ نجاشی نے رواۃ صادق میں شمار کیا ہے۔ کافی، تہذیب،

۲۵۔ ربیع ابن حبیب ۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور بخاری نے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ ابن ماجہ نے ان کی حدیث نقل کی ہے۔

۲۶۔ رحیل ابن معاویہ۔ ان سے زہیر اور شجاع ابن ولید نے روایت کی ہے۔ ابن حبان نے توثیق کی ہے۔ ابن حجر نے صدوق قرار دیا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ان سے روایت نقل کی ہے۔

۲۷۔ رقبہ ابن مصقلہ عبدی کوفی متوفی ۱۳۱ھ۔ ان سے سلیمان تیمی و ابو عوانہ و ابن فضل نے روایت کی ہے اور ثقہ قرار دیا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کی تفسیر میں ان کی روایتیں درج ہیں۔

۲۸۔ رکین ابن ربیع کوفی متوفی ۱۳۱ھ۔ ان سے شعبہ۔ ثوری۔ معمر ابن سلیمان نے روایت کی ہے۔ نسائی اور ابن حجر نے توثیق کی ہے۔ مسلم اور باقی اصحاب صحاح نے اپنی کتابوں میں ان کی روایت درج کی ہے۔ بخاری نے ادب المفرد میں ان کی روایت کو جگہ دی ہے۔

۲۹۔ زکریا ابن اسحاق مکی متوفی ۱۴۸ھ۔ بخاری اور ابوداؤد و ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور صحاح ستہ میں ان کی روایت نقل کی ہے۔

۳۰۔ زیاد ابن سعد خراسانی۔ ان سے ابن جریج وہمام و مالک ابن انس نے روایت کی ہے۔ نسائی اور ابن حجر نے توثیق کی ہے اور صحاح ستہ میں روایتیں درج کی ہیں۔

۳۱۔ زید ابن عطا کوفی۔ ان سے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کی ہے۔

۳۲۔ زہیر ابن محمد تیمی متوفی ۱۶۲ھ۔ ان کا ذکر جلد اول میں ہو چکا ہے۔

۳۳۔ زید ابن حسن قرشی۔ ان سے اسحاق اور ابن مدینی نے روایت کی ہے جیسے ترمذی نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

۳۴۔ سعید ابن سالم کوفی ان سے شافعی و یحییٰ ابن آدم نے روایت کی ہے۔ ابوداؤد اور ابن حجر نے ان کی صداقت کا اعتراف کیا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے ان کی حدیثوں کو نقل کیا ہے۔

۳۵۔ سعید ابن عبدالجبار زبیدی۔ ان کی روایت ابن ماجہ نے نقل کی ہے جسے محمد مقدمی۔ ہشام ابن عبیداللہ و یحیٰی ابن مغیرہ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

۳۶۔ سعید ابن عبدالرحمان مدنی متوفی ۱۷۶ھ۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے۔ ابن وہب و محمد ابن سلیمان و علی ابن حجر نے روایت کی ہے۔ مسلم و ابوداؤد و نسائی و ترمذی و ابن ماجہ نے روایت نقل کی ہے۔

۳۷۔ سلمہ ابن کہیل کوفی متوفی ۱۲۱ھ۔ ان سے یحیٰی و شعبہ و حماد وغیرہ نے روایت کی ہے۔ صحاح ستہ نے ان کی روایتیں درج کی ہیں۔ احمد اور ابن حجر نے توثیق کی ہے۔ امام باقرؑ کی طرف سے مذمت بھی نقل کی گئی ہے۔

۳۸۔ سلیمان ابن مہران کاہلی کوفی متوفی ۱۴۸-۱۴۷ھ۔ صحاح ستہ کے راویوں میں ہیں اور قدیم مذاہب کے رئیسوں میں تھے۔

۳۹۔ سلیمان ابن بلال قرشی متوفی ۱۷۲ھ۔ ان سے ابو عامر و ابن مبارک و معلیٰ ابن منصور و عبداللہ ابن وہب وغیرہ نے روایت کی ہے اور صحاح ستہ نے نقل کیا ہے۔ ابن سعد و ابن عدی و احمد ابن حنبل اور ابن داؤد نے ان کی توثیق کی ہے۔

۴۰۔ سفیان ثوری کوفی متوفی ۱۶۱ھ۔ رئیس مذہب قدیم اور صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ امام صادقؑ کی خدمت میں بکثرت آمد و رفت رکھتے تھے۔ ان کی بہت سی حدیثیں ہیں جسے ابو داؤد، حلبی اور کشی نے نقل کیا ہے۔

۴۱۔ سفیان ابن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ۔ ان کا ذکر پہلی جلد میں ہو چکا ہے۔

۴۲۔ سعید ابن عبدالرحمٰن متوفی ۱۷۶ھ۔ احمد وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے اور بخاری کے علاوہ تمام اصحاب صحاح نے ان کی روایتیں نقل کی ہیں۔

۴۳۔ سنان ابن ہارون کوفی۔ ان سے وکیع اور محمد ابن سلیمان نے روایت کی ہے جسے ترمذی نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔

۴۴۔ سعید ابن طریف کوفی۔ ان سے اسرائیل اور ابن علیہ نے روایت کی ہے جسے ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ شیخ نے ان کی روایتوں کو غیر معتبر اور ابن حجر نے ان کو رافضی

قرار دیا ہے۔

۴۵۔ سعید ابن ابی خیثم کوفی متوفی ۱۸۰ھ۔ ان سے احمد ابن حنبل اور عبداللہ ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے۔ ابن معین وغیرہ نے توثیق کی ہے۔ ترمذی اور نسائی نے اپنے یہاں جگہ دی ہے۔

۴۶۔ سعید ابن حسان قاضی۔ ان سے دونوں سفیان، ابو احمد، زبیری، وکیع، ابو نعیم وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن معین نے توثیق کی ہے۔ ابن حجر نے صادق کہا ہے مسلم و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ نے اپنے یہاں نقل کیا ہے۔

۴۷۔ سعید ابن سالم مکی۔ ابن حجر نے ان کی صداقت کا اعتراف کیا ہے۔ ابن معین نے قابلِ قبول سمجھا ہے۔ ابوداؤد اور ابن عدی نے سچا قرار دیا ہے۔ شافعی و یحیٰی ابن آدم و اسد ابن موسیٰ و احمد بن یونس نے ان سے روایت کی ہے اور ابوداؤد و نسائی نے اسے نقل کیا ہے۔

۴۸۔ سعید ابن مسلمہ ابن ہشام ابن عبدالملک ابن مروان اموی۔ وہبی اور ابن داؤد نے انھیں امام صادقؑ کے راویوں اور شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ امام شافعی و عمر ابن اسمٰعیل و علی ابن میمون عطار نے ان سے روایت کی ہے جسے ترمذی اور ابن ماجہ نے جمع کیا ہے۔

۴۹۔ سالم بن عبدالواحد مرادی کوفی۔ ان سے صباح ابن محارب اور وکیع نے روایت کی ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے مقبول، ابن حبّان نے موثق اور ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

۵۰۔ شعبہ ابن حجاج متوفی ۱۶۰ھ۔ ان کا ذکر جلد اوّل میں ہو چکا ہے۔

۵۱۔ شعیب ابن خالد بجلی۔ ابوداؤد نے ان کی حدیث نقل کی ہے۔ نسائی نے قابلِ قبول قرار دیا ہے اور یحیٰی ابن قیس، حجاج ابن دینار، زہیر ابن معاویہ وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔

۵۲۔ ضحاک ابن مخلد شیبانی متوفی ۲۱۲ھ۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صحاح ستہ

اسے نقل کیا ہے۔

۶۲۔ عطار ابن مسلم حلبی متوفی ۱۹۰ھ۔ ان سے ابن مبارک و ابو تو یہ و عبدالرحمٰن ابن یزید و ہشام ابن عمار نے روایت کی ہے اور ترمذی نے شمائل میں اور نسائی نے سنن میں ان سے نقل کیا ہے۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے۔

۶۳۔ علی ابن حمزہ اسدی متوفی ۱۸۰ھ المعروف بہ کسائی۔ علم نحو کے بہت بڑے استاد تھے۔ اور انہی کے قول کی بنا پر امام جعفر صادق کے راوی تھے۔

۶۴۔ علی ابن صالح ہمدانی کوفی متوفی ۱۵۱ھ۔ ان سے ابن نمیر و وکیع و ابونعیم نے روایت کی ہے جسے بخاری کے علاوہ سب نے نقل کیا ہے۔ احمد و ابن معین و ابن حجر نے ان کی توثیق کی ہے۔

۶۵۔ عوام بن حوشب شیبانی متوفی ۱۴۸ھ۔ صحاح ستہ نے ان کی روایتیں نقل کی ہیں اور عجلی نے ان کی توثیق کرتے ہوئے انھیں تقریباً دو سو حدیثوں کا راوی قرار دیا ہے۔

۶۶۔ عیسیٰ ابن عمر اسدی کوفی متوفی ۱۵۶ھ۔ ان سے ابن مبارک اور وکیع نے روایت کی ہے جسے ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے۔ ابن معین اور نسائی نے ان کی توثیق کی ہے۔

۶۷۔ عبدالجبار ابن عباس ہمدانی۔ ان سے مسلم ابن قتیبہ اور ابن مبارک نے روایت کی ہے اور ابو حاتم اور ابن حجر نے توثیق کی ہے۔ ان کی حدیث کو بخاری نے ادب مفرد میں اور ترمذی نے صحیح میں جگہ دی ہے۔

۶۸۔ عبدالعزیز ابن عبداللہ تمیمی متوفی ۱۶۶ھ۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ لیث اور ابن مہدی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن سعد و ابن حبان و ابن معین نے توثیق کی ہے۔

۶۹۔ عبدالعزیز ابن محمد دراوردی متوفی ۱۸۷ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ اسحاق ابن راہویہ اور یعقوب دورقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن مدینی وغیرہ نے توثیق کی ہے۔

۷۰۔ عبدالعزیز ابن عمران مدنی متوفی ۱۹۷ھ۔ ترمذی کے راوی ہیں۔ ان سے سلیمان و یعقوب ابن محمد و علی ابن محمد مدائنی و محمد ابن عیسیٰ، ابوغسان و ابراہیم ابن منذر وغیرہ نے

میں مذکور ہے۔

۸۷۔ فضیل ابن عیاض تیمی متوفی ۱۸۷ھ۔ ان کا ذکر جلد اوّل میں ہو چکا ہے۔

۸۸۔ فضیل ابن مرزوق کوفی۔ ان سے یحییٰ ابن آدم وغیرہ نے روایت کی ہے۔ دونوں سفیانوں نے توثیق کی ہے۔ ابن معین نے کٹر شیعہ کہا ہے۔ بخاری کے علاوہ سب نے ان سے حدیث نقل کی ہے۔

۸۹۔ فلیح ابن سلیمان خزاعی کوفی متوفی ۱۶۸ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ ابن وہب، ابو عامر وغیرہ نے روایت کی ہے۔ نسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے صداقت کا اعتراف کرتے ہوئے، کثیر الخطا، قرار دیا ہے۔

۹۰۔ قاسم ابن معن متوفی ۱۷۵ھ۔ ان سے مہدی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے۔ ابو حاتم نے توثیق کی ہے اور ابو داؤد و نسائی نے روایت درج کی ہے۔

۹۱۔ قاسم ابن عبد اللہ عمری متوفی ۱۵۰ھ۔ ان سے محمد ابن حسن ابن زبالہ اور عبد اللہ ابن وہیب وغیرہ نے روایت کی ہے۔ جسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ احمد ابن حنبل نے انھیں جھوٹا قرار دیا ہے۔

۹۲۔ محمد ابن اسماعیل کوفی متوفی ۱۶۷ھ۔ ان سے یحییٰ ابن آدم و ابو نعیم و یحییٰ حمانی و محمد ابن حسن ابن مختار نے روایت کی ہے جسے نسائی نے خصائص میں نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے امام صادق کے راویوں میں شمار کیا ہے۔ اور ابن حجر نے شیعہ لیکن صادق کہا ہے۔

۹۳۔ محمد ابن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ۔ ان سے یحییٰ انصاری۔ شعبہ اور دونوں حماد وغیرہ نے روایت کی ہے جسے بخاری کے علاوہ سب نے نقل کیا ہے۔

۹۴۔ محمد ابن فلیح مدنی متوفی ۱۹۷ھ۔ ان سے ابراہیم ابن منذر۔ محمد ابن یعقوب زبیری اور ابو سعید نے روایت کی ہے جسے بخاری، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

۹۵۔ محمد ابن حسن ہمدانی۔ ان سے اسماعیل ابن ابراہیم۔ حسن ابن حماد اور ابن منیع نے روایت کی ہے۔ ترمذی نے نقل کیا ہے۔

راوی ہیں۔
۱۰۲۔ معمر بن یحییٰ کوفی۔ بخاری کے راوی ہیں۔ ابوزرعہ نے توثیق کی ہے۔
۱۰۳۔ منصور بن معتمر کوفی متوفی ۱۳۲ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے شاگرد ہیں۔ عجلی کا بیان ہے کہ ان کی دو ہزار حدیثیں ہیں۔
۱۰۴۔ منہال بن عمر اسدی کوفی۔ مسلم کے علاوہ سب نے ان کی روایت درج کی ہے ابن معین اور نسائی نے توثیق کی ہے۔ شعبہ اور اعمش نے ان سے روایت کی ہے اور انھوں نے امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے۔
۱۰۵۔ میسرہ بن حبیب کوفی۔ ان سے شعبہ اور اسرائیل نے روایت کی ہے۔ ابن معین۔ عجلی اور نسائی نے توثیق کی ہے۔ ابن حجر نے ساتویں طبقہ کا صادق مانا ہے۔ بخاری نے ادب مفرد میں اور ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔
۱۰۶۔ مالک ابن انس متوفی ۱۷۹ھ۔ ان کا ذکر جلد اوّل میں آچکا ہے۔
۱۰۷۔ مکی بن ابراہیم بلخی متوفی ۲۱۵ھ۔ بخاری کے استاد اور صحاح ستہ کے راوی ہیں۔
۱۰۸۔ مسعود بن سعد کوفی۔ ان سے ابوخالد احمر اور ابوغسان نے روایت کی ہے۔ مسلم اور نسائی نے نقل کیا ہے اور ابن معین نے توثیق کی ہے۔
۱۰۹۔ مسلم بن خالد مکی متوفی ۱۸۹ھ۔ ان سے شافعی اور ابن وہب وغیرہ نے روایت کی ہے جسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے۔
۱۱۰۔ مصعب بن سلام کوفی۔ احمد ابن حنبل اور ابوالاشبع نے ان سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے اسے نقل کیا ہے۔ ابن معین اور عجلی نے انھیں قابلِ قبول اور معتبر قرار دیا ہے۔
۱۱۱۔ معاویہ بن صالح حضرمی متوفی ۱۵۸ھ۔ یہ اندلس کے قاضی تھے۔ ان سے ثوری۔ لیث اور ابن وہب نے روایت کی ہے۔ احمد اور ابن معین نے توثیق کی ہے۔ اور بخاری کے علاوہ تمام اربابِ صحاح نے ان سے حدیث لی ہے۔
۱۱۲۔ معاویہ بن عمار بجلی دہنی متوفی ۱۷۵ھ۔ ان سے یحییٰ بن سعید، معاذ بن معاذ وغیرہ

نے روایت کی ہے۔ مسلم، ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے۔ ابن معین و ابوداؤد نے توثیق کی ہے۔ نہج المقال میں ان کی کتاب الصلوٰۃ، کتاب یوم لیلۃ، کتاب الطلاق، کتاب الدعاء کا تذکرہ موجود ہے۔

۱۱۳۔ معروف بن خربوذ مکی۔ ان سے وکیع وغیرہ نے روایت کی ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ یہ امام باقرؑ و امام صادقؑ کے شاگرد تھے۔ (یہ معروف کوفی کے علاوہ دوسرے بزرگ ہیں۔)

۱۱۴۔ مفضل بن صالح اسدی کوفی۔ ان کی حدیث ترمذی نے نقل کی ہے اور ان سے محمد بن عبید، احمد بن بدیل اور محمد بن اسماعیل نے روایت کی ہے۔

۱۱۵۔ نعمان بن ثابت ابوحنیفہ متوفی ۱۵۰ھ۔ ان کا تذکرہ پہلی جلد میں ہو چکا ہے۔

۱۱۶۔ نوح بن دراج کوفی قاضی متوفی ۱۸۲ھ۔ ان سے سعید بن منصور نے روایت کی ہے اور ابن ماجہ نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔

۱۱۷۔ ہارون بن سعد عجلی۔ ابن معین نے انھیں قابل قبول قرار دیا ہے۔ مسلم نے صحیح میں ان کی حدیث نقل کی ہے۔ کشی نے انھیں زیدی المذہب کہا ہے۔ ابن حجر نے رافضی لیکن تائب قرار دیا ہے۔

۱۱۸۔ ہارون بن موسیٰ ازدی۔ ان سے ابن اسد، مسلم بن ابراہیم وغیرہ نے روایت کی ہے جسے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ ابن معین نے ثقہ اور ابن حجر نے ثقہ متہم المذہب قرار دیا ہے۔

۱۱۹۔ ہلال بن ابی حمید صیرفی کوفی۔ ان سے مسعر، شعبہ نے روایت کی ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے نقل کیا ہے۔

۱۲۰۔ وہیب بن خالد بصری متوفی ۱۶۵ھ۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ ابن سعد نے حجت کثیر الحدیث کہا ہے۔ نہج المقال میں ثقہ قرار دیئے گئے ہیں۔ نجاشی نے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۱۔ یحییٰ بن سعید بن فروخ قطان متوفی ۱۹۸ھ۔ اپنے وقت کے جید عالم اور حافظ تھے۔

صحاح ستہ نے ان کی حدیثیں لی ہیں۔ احمد اور ابن معین کے شیخ تھے۔

۱۲۲۔ یحییٰ بن قیس انصاری مدنی متوفی ۱۴۴ھ۔ ان سے اوزاعی، دونوں سفیان وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن مدینی نے ان کی تین سو حدیثوں کا ذکر کیا ہے جسے بخاری نے "الادب المفرد" میں درج کیا ہے۔ ابن سعد نے ثقہ حجت کا لقب دیا ہے۔

۱۲۳۔ یحییٰ بن سلیم طائفی متوفی ۱۹۳ھ۔ ان سے احمد و اسحاق و قتیبہ نے روایت کی ہے۔ ابن معین و نسائی و ابن سعد نے توثیق کی ہے اور بخاری نے قابلِ احتجاج تسلیم کیا ہے۔

۱۲۴۔ یعلیٰ بن الحرث کوفی متوفی ۱۶۸ھ۔ ان سے وکیع ابن مہدی وغیرہ نے روایت کی ہے جسے بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے۔

اس کے علاوہ آپ سے روایت کرنے والے شیعہ حضرات کی فہرست تیسری جلد میں ذکر کی جائے گی اور اس کے بعد چھٹی جلد میں ان شیعہ راویوں کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی حدیثیں صحاح ستہ کے اوراق کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ایسے راویوں کی تعداد بھی تین سو سے زیادہ ہے اس لئے یہاں اختصار کے پیشِ نظر یہ سلسلہ بند کیا جاتا ہے۔

اس بحث کے اہم ترین مآخذ یہ ہیں:۔

۱۔ فہرست	شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی	المتوفی ۴۶۰ھ
۲۔ خلاصہ تہذیب الکمال	احمد بن عبداللہ خزرجی انصاری	
۳۔ منہج المقال	سید محمد استرآبادی	متوفی ۱۰۲۱ھ
۴۔ تہذیب التہذیب	احمد بن علی بن حجر عسقلانی	متوفی ۸۵۲ھ
۵۔ تقریب التہذیب	〃	〃
۶۔ جامع الرواۃ	اردبیلی	متوفی ۱۱۰۱ھ
۷۔ خلاصہ	علامہ جمال الدین حلی	متوفی ۷۲۶ھ
۸۔ الرجال	تقی الدین ابن داؤد	قرن ہفتم
۹۔ حلیۃ الاولیاء	حافظ ابونعیم اصفہانی	متوفی ۴۳۰ھ

کتاب	مصنف	متوفی
۱۰۔ تاریخ بغداد	خطیب بغداد	متوفی ۴۶۳ھ
۱۱۔ شذرات الذہب	ابن عماد حنبلی	متوفی ۱۰۸۹ھ
۱۲۔ تنقیح المقال	عبداللہ مامقانی	متوفی ۱۳۵۱ھ
۱۳۔ لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی	
۱۴۔ تہذیب الاسماء واللغات	محی الدین ابن شرف نووی	متوفی ۶۷۶ھ
۱۵۔ میزان الاعتدال	ذہبیؒ	متوفی ۷۴۸ھ
۱۶۔ طبقات الحفاظ	″	″
۱۷۔ تاریخ الاسلام	″	″
۱۸۔ الجرح والتعدیل	عبدالرحمٰن بن ابی حاتم	متوفی ۳۲۷ھ

توضیح ـــــ اس کے بعد کی دوسری بحث میں داخل ہونے سے پہلے چند نکات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ رواۃ

چونکہ امام جعفر صادقؑ کا مدرسہ فکر اپنے وقت میں بے حد مشہور ہو چکا تھا اور اس میں مختلف عقائد و نظریات، افکار و خیالات کے لوگ داخلہ لے رہے تھے اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ اس میں ہر ایک کا ذہن، ہر ایک کا دماغ اور ہر ایک کا انداز فہم یکساں نہ ہو۔ چنانچہ ان میں سے بعض ایسے مفاد پرست بھی تھے جن کا کام صرف آپ کے بیانات کو مسخ کر کے اس کا غلط پروپیگنڈا کرنا تھا۔

وہب ابن وہب ابوالبختری اس سلسلے میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔

سالم بن ابی حفص عجلی، مغیرہ بن سعید، صائد نہدی۔ محمد بن مقلاص وغیرہ بھی اپنے وقت کے مشہور جعلساز تھے۔

امام جعفر صادقؑ کو ایسے لوگوں کے حالات کا صحیح اندازہ تھا اور آپ یہ جانتے تھے کہ یہ انتہائی خطرناک لوگ ہیں۔ اس لئے آپ نے فی الفور یہ اعلان کر دیا کہ :

"ہم سے جنگ کرنے والا ہمارے حق میں اس سے زیادہ خطرناک نہیں ہے جو ہمارے خلاف باتیں گڑھ کر ہماری طرف منسوب کرتا ہے۔"

"لوگ ہمارے خلاف جھوٹ پر تل گئے ہیں۔ ہم جب بھی کوئی بات کہتے ہیں تو باہر نکلتے ہی اس کی غلط تاویل کر لیتے ہیں۔ یہ حدیث سے ثواب کے طالب نہیں ہیں بلکہ طالب دنیا ہیں اور ان میں سے ہر ایک ریاست کا طلب گار ہے۔"

بعض لوگوں کا کاروبار تو یہ تھا کہ حضرت کی حدیثیں کم و زیاد کر کے بیان کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت سے عرض کی کہ میں نے "آپ کا یہ ارشاد سنا ہے "جب تمہیں معرفت حاصل ہو جائے تو جو چاہو کرو۔" آپ نے فرمایا بالکل غلط ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ "جب تمہیں معرفت ہو جائے تو جو چاہو کرو، اتنا ہی تم سے قبول کیا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ شیطان ہم اہلبیت کے درمیان ایسے لوگوں کو داخل کر دیتا ہے جن کا ہم سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ پھر جب اس کی کوئی شخصیت بن جاتی ہے تو وہ ہمارے خلاف جھوٹ بولنے لگتا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے عملی طور پر اس قسم کے افراد سے قطع تعلق کر کے اور امت کو ان سے ڈرا کے ان کے فتنوں کا قلع قمع کیا۔ علماء رجال نے بھی اسی کام کے لئے پوری پوری بحثیں کیں۔ سچے جھوٹے اور اچھے برے کا امتیاز قائم کرنے کے لئے علمی معیار مقرر کئے اور اس طرح صحیح و ضعیف کے تفرقہ کے لئے حسب ذیل قسم کی کتابیں تالیف کیں۔

کتاب الرجال	شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی	متوفی ۴۶۰ھ
کتاب	الشیخ احمد بن علی بن احمد النجاشی	متوفی ۴۵۰ھ
کتاب الضعفاء	احمد بن عبید اللہ غضائری	
کتاب تقی الدین حسن بن علی بن داؤد شاگرد ابن طاؤس و محقق حلی		
خلاصہ	علامہ جمال الدین حلی	متوفی ۷۲۶ھ

علم رجال میں راویوں کی جانچ پڑتال کے لئے علماء اہلسنت نے بھی کافی احتیاط سے کام لیا ہے لیکن علماء شیعہ نے اس کے علاوہ بھی بعض شرائط کا اضافہ کر کے اس علم کو مزید

استحکام بخشا ہے اور دین کے معاملہ میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی ہے۔ خود رسولِ اکرمؐ کا بھی مشہور ارشاد ہے کہ میرے خلاف حدیث گڑھنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۲۔ مشاہیر ثقات

امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جن کی وثاقت شہرۂ آفاق اور جن کا اعتبار مسلم الثبوت ہے لیکن افسوس کہ اس مقام پر ان کے تذکرہ کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو تیسری جلد میں اس کی قدرے تفصیل بیان کی جائے گی۔ اس وقت صرف چند مؤلفین کے نام بطور فہرست درج کئے جا رہے ہیں:۔

۱۔ ابراہیم بن خالد عطار عبدی
۲۔ ابراہیم بن نعیم عبدی المعروف بہ ابی الصباح
۳۔ اسحاق بن بشر کاہلی
۴۔ اسحاق بن جندب
۵۔ انس بن عیاض لیثی
۶۔ برد الاسکاف ازدی
۷۔ ایوب بن عطیہ حذاء
۸۔ ثابت بن جریر
۹۔ ثابت بن ضریر
۱۰۔ ثعلبہ بن میمون فقیہ
۱۱۔ جحدر بن مغیرہ طائی
۱۲۔ جفیر بن الحکم عبدی
۱۳۔ جمیل بن دراج
۱۴۔ حارث بن مغیرہ نضری
۱۵۔ حبیب بن نعمان اسدی
۱۶۔ حذیفہ بن زائدہ اسدی
۱۷۔ حریز بن عبداللہ سجستانی
۱۸۔ حسان بن مہران کوفی
۱۹۔ حسن بن حسین جحدری کندی
۲۰۔ خطاب بن مسلم کوفی
۲۱۔ خلاد بن سرحان عطار کوفی
۲۲۔ رافع بن سلمہ بن زیاد اشجعی
۲۳۔ زریق بن زبیر خلقانی
۲۴۔ زکریا بن یحییٰ واسطی
۲۵۔ زید بن یونس شحام کوفی
۲۶۔ سالم حناط کوفی
۲۷۔ سالم بن مکرم بن عبداللہ
۲۸۔ سری بن عبداللہ سلمی کوفی
۲۹۔ سعید بن عبدالرحمٰن سمان کوفی

۳۰۔ سعید بن غزوان اسدی
۳۱۔ سلام بن ابی عمرہ خراسانی (ان کی کتاب آج تک موجود ہے۔ الذریعہ ۶ ۳۳۶)
۳۲۔ سلیم فراء کوفی
۳۳۔ سلیمان بن داؤد منقری
۳۴۔ سماعہ بن مہران حضرمی
۳۵۔ سوید بن مسلم
۳۶۔ سیف بن سلیمان تمار کوفی
۳۷۔ شعیب عقرقوفی
۳۸۔ شہاب بن عبدربہ
۳۹۔ صباح حذاء بن صبیح کوفی
۴۰۔ صباح بن یحییٰ مزنی (تلمیذ امام باقرؑ و صادقؑ)
۴۱۔ صفوان بن مہران کوفی
۴۲۔ طلاب بن حوشب شیبانی کوفی
۴۳۔ عاصم بن سلیمان بصری
۴۴۔ عامر بن جداعہ ازدی
۴۵۔ عبید بن زرارہ بن اعین
۴۶۔ عبیداللہ بن الولید رصافی (راوی امام باقرؑ و صادقؑ)
۴۷۔ عقبہ بن خالد اسدی
۴۸۔ علی بن عقبہ بن خالد اسدی
۴۹۔ عمار بن مروان یشکری
۵۰۔ عمار بن موسیٰ ساباطی
۵۱۔ عمرو بن ابراہیم ازدی
۵۲۔ عمرو بن الیاس بجلی
۵۳۔ عمرو بن حریث صیرفی
۵۴۔ عمرو بن خالد خیاط
۵۵۔ عمرو بن منہال صیرفی
۵۶۔ ابو محمد بن قتیبہ اعشی مغربی
۵۷۔ کعیب بن عبداللہ کوفی
۵۸۔ مالک بن عطیہ احمسی
۵۹۔ محمد بن حمران نہدی
۶۰۔ محمد بن عذافر صیرفی (صحابی امام صادقؑ و کاظمؑ)
۶۱۔ عباد بن صہیب بصری
۶۲۔ عباس بن الولید کوفی
۶۳۔ عبدالحمید بن ابی العلاء ازدی
۶۴۔ عبدالرحمٰن بن محمد فزاری
۶۵۔ عبدالغفار بن حبیب طائی
۶۶۔ عبدالغفار بن قیس انصاری (تلمیذ امام باقرؑ و صادقؑ)
۶۷۔ عبدالکریم بن ہلال جعفی خلقانی
۶۸۔ عبداللہ بن ابی یعفور
۶۹۔ عبداللہ بن بکیر بن اعین شیبانی

۷۰۔ عبداللہ بن زرارہ بن اعین
۷۱۔ عبداللہ بن سعید بن شبل
۷۲۔ عبداللہ بن غالب اسدی فقیہ
۷۳۔ عبداللہ بن الفضل نوفلی
۷۴۔ عبدالملک بن حکیم خثعمی کوفی
۷۵۔ عبدالملک بن عتبہ نخعی صیرفی کوفی

اس کے علاوہ فہرست طوسی، کتاب نجاشی اور جامع الرواۃ میں مؤلفین کا ایک سلسلہ ہے جسے آقائے بزرگ محمد محسن طہرانی (طاب ثراہ) نے کتاب "الذریعہ" کی چھٹی جلد میں حرف ح کے سلسلے میں اور پہلی جلد میں حرف ہمزہ کے ذیل میں ذکر فرمایا ہے۔ ہم نے سابق میں بعض حضرات کا ذکر کر دیا ہے اور باقی کا آیندہ تذکرہ کریں گے۔

۴۔ جابر بن حیان

علم کیمیا میں جابر کی شخصیت شہرۂ آفاق حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اس علم میں نام پیدا کیا ہے۔ ان کو صوفی اور حرانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے موضوعِ بحث سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے ہیں لیکن بعض اسباب کی بنا پر کسی حد تک ان کے حالات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جابر نے علم کیمیا کے توازن کی بحثیں اور فلسفہ کے اہم مباحث کو اجاگر کیا ہے اور نئی نئی تحقیقات منظر عام پر لے آئے ہیں۔ ان کی تالیفات کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور بعض لوگوں نے انھیں الجبرا کا موجد قرار دیا ہے۔ علم کیمیا کے بارے میں انھوں نے ہزار صفحہ کے پانچ سو رسالے تالیف کئے ہیں۔ ان کے بارے میں اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک موہوم شخصیت ہے جسے نمونہ کے طور پر وضع کر لیا گیا ہے ورنہ تاریخ عرب میں ایسی کسی عظیم ہستی کا ذکر نہیں ہے۔

اس کا جواب ابن ندیم نے فہرست میں یہ دیا ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے متعدد تجربات کئے ہوں۔ علوم کے ذخیرے مہیا کئے ہوں۔ لوگوں کو جدید تحقیقات سے آشنا کیا ہو اس کے بارے میں وجود و عدم کی بحث انتہائی جہالت اور حماقت ہے۔ جابر ایک شہرۂ آفاق شخصیت ہے جس کی تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں۔

بعض لوگ انھیں خراسانی کہتے ہیں اور رازی نے انھیں اپنا استاد کہہ کر ظاہر کیا

ہے۔ ان کے تالیفات مذہب شیعہ اور مختلف علوم کے بارے میں بکثرت ہیں جن کا تذکرہ برمحل کیا جاچکا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

مستشرقین کے درمیان بھی جابر کے بارے میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مستشرق کراؤس نے ان کی تالیفات کو شائع کیا ہے جس میں شیعیت کے دلائل واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔

لیکن بعض مستشرقین کو یہ بات کھل گئی اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ کیمیا میں اوّلیت کا شرف کسی مسلمان عرب کو مل سکے اس لئے انھوں نے کبھی ان کے وجود کو مشکوک بنایا کبھی ان کے دور میں شک کیا۔ کبھی ان کی کتابوں کو بے اعتبار ٹھہرایا۔ کبھی ان کے امام صادقؑ سے استفادہ کرنے کا انکار کیا اور کبھی کتابوں کی ترتیب و تہذیب پر اعتراض کیا کہ یہ سلیقہ اس دور کے انسان کے لئے غیر معروف ہے۔

استاد اسماعیل مظہر نے رسالۃ المقتطف میں (۶۸، ۵۴۴ و ۶۱۷ تا ۶۲۵) اور استاد احمد زکی صالح نے "الرسالۃ" عدد ۸ ۱۲۰۴، ۱۲۰۹ پر ان تمام اوہام کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور یہ واضح کر دیا ہے کہ جابر شیعہ مذہب انسان تھے اور شیعوں نے علوم کے سلسلے میں بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں یہاں تک کہ مذہب کو فلسفی رنگ دینے میں امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کا اپنا ایک مخصوص فلسفہ مشہور ہو گیا ہے۔ (حیاۃ الامام الصادق المظفر)

بعض لوگوں نے ایک شاعر کے کلام سے تمسک کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ جابر خالد بن یزید کے شاگرد تھے اور خالد وہ بزرگ ہیں جنھوں نے حضرت علیؑ کی خلافت کا اعتراف کرتے ہوئے خود حکومت سے دست کشی کر لی تھی۔ (کشف الظنون ۲ ۱۹۸) لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات انتہائی مہمل ہے اس لئے کہ جابر نے خود اپنے رسالوں میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ میں نے یہ باتیں براہِ راست امام جعفر صادقؑ سے لی ہیں۔ (رسائل جابر نشر کردہ مستشرق کراؤس ص۳۳۵) خواص کبیر کے ص۲۰۵ پر جابر کا بیان ہے کہ میں ایک دن امام جعفر صادقؑ کے گھر جا رہا تھا... اس کے علاوہ جا بجا اس کی تصریح موجود ہے۔ ص۳۱۶ مقالہ ۲۴ میں لکھتے ہیں کہ حضرت نے مجھے ان خواص کے جمع کرنے کا حکم دیا اور آئندہ بھی ایسے تحقیقات کے اضافہ

کا مشورہ دیا۔

وفیات الاعیان ابن خلکان، مراۃ الجنان یافعی، تاریخ ابن الوردی، کشف الظنون، دائرۃ المعارف پطرس بستانی، قاموس الاعلام ترکی وغیرہ میں اس بات کی تصریح و تفصیل بقدر ضرورت موجود ہے۔

استاذ محمد یحییٰ نے اپنی کتاب "امام صادق ملہم الکیمیا" میں لکھا ہے کہ علوم کی تاریخ میں جابر کا مسئلہ اور ان کا امام جعفر صادق سے ارتباط بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع کو اکثر مستشرقین اور اہل کیمیا نے محل بحث بنایا ہے لیکن کوئی قابل اطمینان کام نہیں کیا ہے اس لئے کہ انھوں نے موضوع کے دیگر مصادر کی چھان بین کی ہے اور خود جابر کے بیانات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم جابر ہی کے رسائل کی روشنی میں اس بحث کا تجزیہ کریں اور امام صادق کے فکری خدمات کا صحیح جائزہ لیں!.... اس کے بعد ص ۳۹ پر لکھتے ہیں کہ جابر کے چھوڑے ہوئے علمی ذخیرہ کی چھان بین کرنے کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھیں یہ سب کچھ امام جعفر صادق سے ملا تھا۔ مستشرقین کو یہ حقیقت معلوم تھی لیکن انھیں یہ بات پسند نہیں آئی اس لئے انھوں نے تنقید میں عجیب و غریب پہلو اختیار کئے اور آخر میں یہ کہہ دیا کہ امام صادق کو اتنے علوم و فنون میں دستگاہ ناممکن ہے۔ دروسکا کا کہنا ہے کہ مدینہ میں بیٹھ کر امام صادق کو کیمیا کے اصول و عملیات کا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ برٹلو فرانسیسی اور ہولمیارڈ انگریزی کو جابر کی طرف منسوب شدہ معلومات نے حیرت میں ڈال دیا ہے۔"

اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جنھیں استاد موصوف نے ذکر کیا ہے لیکن ہم اس موضوع سے غیر متعلق ہیں اس لئے انھیں ترک کئے دیتے ہیں۔ ہم نے تو امام صادق کے شاگردوں کی مناسبت سے جابر کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا ورنہ تفصیلات کے لئے دوسرا محل درکار ہے۔

۴۔ فرقے

امام جعفر صادق کا مدرسہ مختلف علوم و فنون کا مرکز تھا اس لئے اس کا کوئی تعلیمی دستور مرتب نہ ہو سکا تھا۔ مختلف مسائل کے ضرورت مند ارباب نظر آیا کرتے تھے اور اپنی ضرورت کے

مسائل دریافت کیا کرتے تھے، کبھی آپ خود سے علوم وفنون پر روشنی ڈالتے تھے اور کبھی اصحاب کو جمع کر کے اپنے آباء واجداد کی حدیثیں اور علم کلام کے نکات نوٹ کرایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ دور دور سے تحصیلِ علم کی غرض سے آتے اور اپنی علمی تشنگی رفع کیا کرتے تھے۔ آپ نے عراق ومکہ میں مختلف مذاہب کے اربابِ فکر سے بحثیں کیں۔ انھیں ان کے مسلک کی غلطی سے آگاہ کیا اور صراطِ مستقیم کی ہدایت کی۔ بعض نے صدقِ دل سے استفادہ کیا اور بعض نے عناد وفساد سے کام لیا اور تحصیل علم کو "فساد فی الارض" کا وسیلہ بنا لیا۔

امام صادق سے متعلق مختلف علمی بحثیں ہیں جنھیں اس مقام پر ذکر ہونا چاہئے تھا لیکن ہم نے انھیں صرف اس لئے ترک کر دیا ہے کہ یہ بحث ہر جلد میں مختلف مقامات پر ہوتی رہے گی۔ آپ کے سلسلۂ نسب کو بھی محلِ بحث سے خارج کر دیا ہے کہ آپ کا حسب ونسب پوری طرح واضح ہے۔ ائمہ اربعہ کے حسب ونسب کو تو اس لئے زیرِ بحث لایا گیا تھا کہ ان کے حسب ونسب پر اور زمان ومکان کے بارے میں بکثرت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تاہم ایک مختصر اشارہ امام محمد باقر کی زندگی کے بارے میں ضرور کریں گے کہ ان سے حضرت کا تعلق براہ راست ہے اور اس کی روشنی میں آپ کی زندگی کا جائزہ لینے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

پدرِ بزرگوار امام محمد باقرؑ
کے
سایۂ عاطفت میں

ابو جعفر محمدؑ بن علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ ابن ابی طالب علیہم السلام

امام جعفر صادقؑ نے اپنی حیاتِ طیبہ کا ایک بڑا حصّہ اپنے پدر بزرگوار امام محمد باقرؑ اور اپنے جدنامدار امام زین العابدینؑ کی آغوش عاطفت میں گذارا ہے۔ انھیں بزرگوں نے آپ کی پرورش کی اور انھیں کے ذریعہ اسرارِ الٰہی آپ تک منتقل ہوئے۔ ہم اس مقام پر ان حضرات کی مکمل سیرت کے تذکرہ سے معذور ہیں لیکن امام محمد باقرؑ کے بعض حالات کی طرف ضرور اشارہ کریں گے ـــــ کہ آپ ہی کے دور میں اہلبیتؑ کے مدرسۂ تربیت کی بنیاد پڑی اور آپ ہی کے مدرسہ میں بڑے بڑے اصحاب اور تابعین نے شرف شاگردی حاصل کیا ہے۔ آپ نے بے شمار تشنگانِ علوم کو سیراب کیا ہے اور دین و مذہب کو لامذہب علماء کے فتووں سے پاک و پاکیزہ بنایا ہے۔

ولادت

امام محمد باقرؑ مدینہ میں ۵۷ھ میں پیدا ہوئے اور بقول شیخ مفید، نہایہ ابن کثیر، تاریخ ابن اثیر، ۵۷ سال کی عمر میں ۱۱۴ھ میں انتقال فرمایا۔ مسعودی کے خیال میں آپ کا انتقال ولید کے دور میں ہوا۔ آپ نے ابتدا کے تین چار سال امام حسینؑ کے زیر سایہ گذارے جس میں کربلا کا المناک سانحہ بھی پیش آیا۔ ۳۴ سال پدر بزرگوار کے ساتھ رہے اور ۱۸۔۱۹ سال ان کے بعد زندگی گذاری۔ آپ کے دورِ حیات میں حسب ذیل حکام برسر اقتدار آئے۔

معاویہ ابن ابی سفیان، یزید بن معاویہ، معاویہ بن یزید، مروان بن الحکم، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک۔

کنیت ولقب

آپ کی کنیت ابوجعفر اوّل اور لقب باقرؑ ہے۔ باقر کے معنی شگافتہ کرنے والے ہیں۔ اور آپ کو باقر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آپ نے علوم میں موشگافیاں کر کے اس کی وسعتوں کو کہیں زیادہ بڑھا دیا ہے۔ (قاموس ا ۳۷۶، لسان العرب ۵ ۱۴۰، حیاۃ الحیوان ا ۱۴۷، تاریخ ابوالفداء ا ۲۱۵)

* ذہبی کا بیان ہے کہ یہ لقب آپ کو رسول اکرمؐ نے عطا فرمایا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ا ۱۱۷)
* جابر بن عبداللہ انصاری متوفی ۷۸ھ کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا۔ جابر تم اس وقت تک زندہ رہو گے کہ میرے ایک فرزند سے ملاقات کرو گے جو حسینؑ کی نسل سے ہوگا اور علوم میں وسعت پیدا کرے گا۔ لہذا جب اس سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہہ دینا۔ (حاشیہ القاموس المحیط ا ۳۷۶، الفصول المہمہ ابن صباغ مالکی ص۱۹۳)
* یعقوبی کی روایت کی بنا پر آنحضرتؐ نے جابر سے فرمایا تم عنقریب میرے اس فرزند سے ملو گے جو میری شبیہ ہوگا اور اس کا نام میرا نام ہوگا۔ لہذا جب اس سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہہ دینا۔ اس حکم کے بعد جابر جب ضعیف ہو گئے تو برابر "یا باقر یا باقر" کہا کرتے تھے۔ (تاریخ یعقوبی ۳ ص۶۱)
* مدائنی نے جابر کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسینؑ آپ کی گود میں بیٹھے تھے آپ انھیں کھلا رہے تھے۔ اسی دوران آپ نے فرمایا اے جابر اس کے یہاں ایک بچہ ہوگا جس کا نام علیؑ ہوگا اور وہ روزِ قیامت زین العابدین کے لقب سے یاد کیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک فرزند متولد ہوگا جس کا نام محمدؐ ہوگا۔ جب اس سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہہ دینا۔ (تذکرۃ الخواص ص۳۴۴، احسن القصص

سید علی فکری ۴ ص۳۸)

* شبلنجی نے یہی روایت زبیر بن محمد بن مسلم سے نقل کی ہے۔ (نورالابصار ص۱۴۲)
عیون الاخبار ابن قتیبہ کی روایت ہے کہ حضرتؐ نے جابر سے فرمایا کہ تمھاری زندگی میں میرا ایک فرزند متولد ہوگا جس کا نام میرا نام ہوگا۔ وہ علم کی وسعتوں میں اضافہ کرے گا۔ لہٰذا جب اس سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔ (عیون الاخبار ا ص۲۱۲)
بہر حال علوم اسلامیہ میں آپ کی منفرد شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تاریخ علم پر آپ کے احسانات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ اور بات کہ تاریخ نے بہت کم افراد کو ان کی اصلی جگہ پر بٹھایا ہے۔

اقوالِ علماء

* محمد باقرؑ کو دیکھنے سے پہلے میں یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ امام زین العابدینؑ کی اولاد میں کوئی ان کا جیسا بھی ہوسکتا ہے۔ (محمد بن المنکدر)
* علماء اعلام کو محمد باقرؑ کے علاوہ کسی کے سامنے ناچیز ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔
(عبداللہ بن عطار۔ حلیۃ الاولیاء)
* محمد بن علیؑ کو باقر اسی لئے کہتے ہیں کہ انھوں نے علوم میں موشگافیاں کی ہیں۔ ان کی والدہ ام عبداللہ بنت ام حسن تھیں۔ وہ تابعی جلیل تھے۔ ان کی جلالت و امامت پر اتفاق ہے۔ ان کا شمار مدینہ کے عظیم فقہاء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جابر و انس و ابوالمسیب و ابن الحنفیہ وغیرہ سے روایتیں[1] سنی ہیں اور ان سے ابو اسحاق سبیعی، عطاء بن ابی رباح، عمر بن دینار، زہری، ربیعہ وغیرہ جیسے بزرگ تابعین نے روایتیں

[1] پہلی جلد میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ائمہ معصومینؑ کے بارے میں اخذ روایت، سماع روایت یا نقل روایت کے الفاظ عام اسلامی ذوق کے تحت استعمال ہوتے ہیں ورنہ درسگاہِ "علام الغیوب" کے تعلیم یافتہ دنیا کے کسی انسان سے کسب علم و فیض کے قطعاً محتاج نہیں تھے۔ (جوادی)

لی ہیں۔ بخاری اور مسلم نے ان کی حدیثیں نقل کی ہیں ـــــ محی الدین ابن شرف النووی المتوفی ۶۷۶ھ (تہذیب الاسماء واللغات)

* ابوجعفر محمدؑ بن زین العابدینؑ۔ امام جعفر صادقؑ کے والد اور شیعوں کے ایک امام ہیں۔ انھیں باقرؑ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے علم کو وسیع بنایا ہے۔ عبداللہ بن عطاء اپنے کو ان کے مقابلہ میں ہیچ تصور کرتے تھے۔ وہ ۵۶ سال زندہ رہے اور اپنے والد کے ساتھ بقیع میں دفن ہوئے ـــــ عفیف الدین یافعی (مرآۃ الجنان ا ص۲۴۸)

* ابوجعفر محمد باقرؑ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار فقہاء مدینہ میں تھا۔ وسعتِ علم کی وجہ سے باقر لقب پایا۔ شیعوں کے بارہ اماموں میں سے ایک امام تھے۔ عبداللہ بن عطاء ان کے سامنے اپنے کو ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کے نصائح و مواعظ بکثرت ہیں۔ ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا اور بقیع میں دفن ہوئے ـــــ عبدالحی بن حماد حنبلی۔ (شذرات الذہب ا ص۱۴۹)

* محمدؑ بن علیؑ باقرؑ۔ علم کے توسیع دینے والے، اس کے علمدار، اس کے منافع حاصل کرنے والے اور اس کی تزئین کرنے والے تھے۔ ان کا دل صاف، عمل پاکیزہ، نفس طیب اور اخلاق شریف تھا۔ طاعت الٰہی میں وقت گذارتے تھے۔ تقویٰ میں قدم راسخ رکھتے تھے۔ طہارت و نجابت کی نشانیاں چہرے سے ہویدا تھیں۔ مناقب ان کی طرف سبقت کناں اور اوصافِ کمال ان کی ذات پر نازاں تھے۔ ۳ / صفر ۵۷ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ باقر و شاکر و ہادی لقب پایا۔ علمی عظمت کی بنا پر باقر کے لقب سے مشہور ہو گئے ـــــ محمد بن طلحہ قرشی عدوی شافعی (مطالب السئول ۲ ص۵۰)

* ابوجعفر باقرؑ امام ہاشمی علوی تھے۔ انھوں نے اپنے والد بزرگوار، جابر، ابوسعید، ابن عمر، عبداللہ بن جعفر وغیرہ سے روایت کی ہے۔ عائشہ، ام سلمہ اور ابن عباس سے بھی مرسلاً روایت کی ہے۔ ان سے جعفر بن محمد، عمر بن دینار، اوزاعی، ابن جریج، قرۃ بن خالد وغیرہ نے روایتیں لی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں بنی ہاشم کے سردار تھے۔ وسعت علم کی بنا پر باقر لقب پایا۔ نسائی وغیرہ نے ان کا شمار فقہاء مدینہ میں کیا ہے۔ ۱۱۴ھ یا ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا ـــــ شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ھ۔ (تذکرۃ الحفاظ ا ص۱۱۷)

* ابو جعفر باقرؒ ـــــ تابعی جلیل القدر تھے علم و عمل و سیادت و شرف کے اعتبار سے امت میں ممتاز تھے۔ وسعت علم کی وجہ سے باقرؒ کہے گئے۔ یادِ خدا میں مشغول، صبر و شکر میں منہمک اور خانوادۂ رسالت کا خلاصہ تھے۔ نسب کے اعتبار سے بلند، حسب کے لحاظ سے شریف، خطرات سے آگاہ اور عبرتوں پر گریہ کناں تھے۔ لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ دامن کشاں رہتے تھے ـــــ عمادالدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر (البدایۃ والنہایۃ ۹ ص۳۰۹)

* محمد بن علی ابو جعفر باقرؒ ـــــ امام حسنؑ کے نواسے تھے۔ انھوں نے اپنے والد، امام حسنؑ۔ امام حسینؑ اور حضرت علیؑ سے مرسلاً روایت کی ہے۔ ان سے امام جعفرؒ، اسحاق سبیعی، اعرج، زہری، عمر بن دینار، موسیٰ بن سالم، قاسم بن فضل، اوزاعی، ابن جریح، شیبہ بن نصاح، عبداللہ بن ابی بکر بن عمر بن حزم، عبداللہ بن عطاء، بسام صیرفی، حرف بن صریح، حجاج بن ارطاۃ، محمد بن سوقہ، مکحول بن راشد، معمر بن یحییٰ بن بسام وغیرہ نے روایت لی ہے ـــــ شہاب الدین ابن حجر (تہذیب التہذیب ۹ ص۳۵۰)

* محمدؒ بن علیؑ بن الحسینؑ ـــــ امام جعفر صادقؑ کے والد اور تابعی عادل ثقہ تھے۔ وسعتِ علم کی بنا پر باقرؒ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ۱۱۷ھ میں وفات پائی اور اپنے والد کے ساتھ بقیع میں مدفون ہوئے ـــــ تلسانی (شرح الشفاء خفاجی ۱ ص۲۹۲)

* محمد باقرؒ ابن زین العابدینؑ ـــــ ۳ صفر ۵۷ھ کو واقعہ کربلا سے تین برس قبل متولد ہوئے۔ ابو جعفر کنیت اور وسعتِ علوم کی بنا پر باقرؒ لقب پایا۔ آپ کے علوم کی خبریں مشہور اور آپ کی مدح سے قصائد کی دنیا معمور ہے۔ مالک جہنی نے اپنے اشعار میں آپ کو علوم قرآن کا واقعی وارث و حامل قرار دیا ہے۔ ۵۸ یا ۶۰ سال کی عمر میں ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ ۳ سال امام حسینؑ کے ساتھ، ۳۴ سال پدر بزرگوار کے ساتھ اور ۱۹ سال ان کے بعد گذارے ـــــ محمد بن عامر (اتحاف ص۵۲)

* محمدؒ بن علیؑ بن الحسینؑ ـــــ آپ کو باقرؒ کے لقب سے اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ آپ نے علوم و معارف کے اسرار کو اسی طرح واضح کیا ہے جس طرح ایک کاشتکار زمین کے خزانوں کو باہر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ آپ کا علم و کمال، زہد و تقویٰ، اخلاق و شرف شہرۂ آفاق

ہے۔ کنیت ابوجعفر اور القاب باقر و شاکر و ہادی ہیں۔ آپ کے شرف کے لئے ابن المدینی کی یہ روایت کافی ہے کہ جابر بن عبداللہ نے آپ کے بچپنے میں رسول اکرمؐ کا سلام پہنچایا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ آخر یہ سلام کیسا ہے تو انھوں نے بیان کیا کہ میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حسینؑ آپ کی آغوش میں بیٹھے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جابر! اس فرزند سے ایک مولود متولد ہوگا جو روزِ قیامت زین العابدین کے لقب سے پکارا جائے گا اور اس سے ایک فرزند متولد ہوگا جس کا نام محمدؐ ہوگا۔ دیکھو جب اس سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا ——— محمد بن عبدالفتاح حنفی (جوہرۃ الکلام ص ۱۳۴۔۱۳۵)

* ابوجعفر محمدؑ بن علیؑ باقر ——— شیعوں کے پانچویں امام اور انتہائی عابد و زاہد تھے۔ مختلف علوم اور تفسیر قرآن میں ان کے اقوال مشہور ہیں۔ مدینہ میں متولد ہوئے اور مدینہ ہی میں وفات پائی ——— زرکلی (الاعلام ج ۳ ص ۹۴۳)
* محمدؑ باقر ابن زین العابدینؑ ——— کا لقب باقر اس لئے تھا کہ ان کو علوم کے اسرار و اصول سے واقفیت حاصل تھی۔ ان کی منزل کو بیان کرنے سے زبانیں عاجز ہیں۔ سلوک و معرفت میں آپ کے کلمات شہرۂ آفاق ہیں۔ منجملہ

"بجلیاں مومن اور غیر مومن سب پر گرتی ہیں لیکن یاد خدا کرنے والے پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔"

"جس دل میں غرور داخل ہوگا اس سے عقل نکل جائے گی۔"

"شکم و شرمگاہ کے تحفظ سے بڑی کوئی عبادت نہیں ہے۔"

"دنیا میں بھائیوں پر احسان سے زیادہ کوئی کارآمد شئے نہیں ہے۔"

"بدترین بھائی وہ ہے جو مالداری میں تعلقات رکھے اور فقیری میں قطع تعلق کرلے۔"

"دوسرے کے دل میں اتنی ہی محبت سمجھنا چاہئے جتنی دوسرے کے لئے اپنے دل میں ہو۔"

اس کے علاوہ ایسے بے شمار فقرات دامنِ تاریخ میں محفوظ ہیں ——— مناوی (الکواکب الدریہ ص ۱۶۹)

* ابو جعفر محمدؑ بن علیؑ بن الحسینؑ ــــ آپ کی والدہ ام عبداللہ بنت الحسن تھیں۔ آپ کے فرزند جعفر بن محمدؑ اور عبداللہ بن محمد تھے جن کی والدہ ام فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر تھیں۔ اور ابراہیم کی والدہ امِ حکم بنت اسد بن المغیرہ اور علی بن محمد و زینب بنت محمد کی والدہ امّ ولد تھیں جس طرح امّ سلمہ بنت محمد کی والدہ بھی امّ ولد تھیں۔ آپ کا انتقال ۷۳ سال کی عمر میں ۱۱۴ھ یا ۱۱۸ھ میں ہوا۔ فضل بن دکین نے ۱۱۴ھ کو ترجیح دی ہے۔ حضرت باقرؑ کثیر الحدیث عالم تھے لیکن آپ سے کسی قابلِ اعتبار آدمی نے روایت نہیں کی ہے۔ (طبقات ابن سعد ۵ ص۱۳۸)

اس مقام پر آنحضرت کے بارے میں تمام اقوال و آرار کا جمع کرنا مقصود نہیں تھا۔ اس لئے اسی مقدار پر اکتفا کی جاتی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے وقت کے یگانۂ روزگار اور ان تمام صفاتِ کمال کے جامع تھے جن کی ایک مرجع امت کو ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن اس جگہ پر ابن سعد کے اس آخری فقرے سے بحث کرنا ضروری ہے جس میں انھوں نے حضرت سے کسی معتبر آدمی کے روایت کرنے کا انکار کیا ہے۔ مجھے حیرت و تعجب ہے کہ ابن سعد نے اتنا بڑا اتہام کیونکر لگا دیا اور تاریخ و حدیث سے اتنا عظیم تغافل کس طرح مناسب خیال کیا۔ کیا ان کے بیان کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ جس جس نے امام محمد باقرؑ سے روایت کر دی ہے وہ سب غیر معتبر ہو گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اکثر تابعین و علمار اور اربابِ صحاح اس کی زد میں آجائیں گے کہ ان حضرات نے روایت کو نقل بھی کیا ہے اور اس سے استدلال بھی کیا ہے۔

ممکن ہے کہ ابن سعد کی مراد شیعہ راوی رہے ہوں اور ان کا غیر معتبر قرار دینا ان کی نظر میں ذاتی عقائد یا سماجی حالات کی بنا پر ضروری رہا ہو۔ ابن سعد کے ذاتی عقائد و افکار ہمیں بخوبی معلوم ہیں لیکن ہم ان پر بحث کر کے گفتگو کو طول دینا نہیں چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس مقام پر چند ان تابعین و علمار کے نام درج کر دیں جنھوں نے امام باقرؑ سے روایت کی ہے اور انھیں خود ابن سعد نے طبقات میں معتبر قرار دیا ہے۔ بلکہ اصحابِ

صحاح نے بھی ان کی روایتوں سے استدلال کیا ہے۔

تلامذہ و رواۃ

* عمرو بن دینار کوفی اثرم متوفی ۱۱۵ھ۔ جلیل القدر عالم اور صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ان سے قتادہ، شعبہ، ہر دو سفیان و حماد وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن معین نے ان کی حدیثوں کی تعداد پانچ سو بتلائی ہے۔ مسعر نے انھیں تین مرتبہ تکرار کے ساتھ موثق کہا ہے۔ ابن نجیح کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ فقیہ و عالم دیکھا ہی نہیں گیا ہے بلکہ بقول بعض عطاء و طاؤس بھی ان کے برابر کے نہ تھے۔
* عبدالرحمٰن بن عمر اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ۔ صحاح ستہ کے راوی اور قدیم مذاہب میں سے ایک مذہب کے رئیس تھے۔ ان کا مفصل تذکرہ جلد اوّل میں ہو چکا ہے۔
* عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج اموی متوفی ۱۵۰ھ۔ ان سے یحییٰ بن سعید انصاری اور دونوں سفیان نے روایت کی ہے۔ بہت زبردست عالم تھے۔ اصحاب صحاح ستہ نے ان کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ احمد کی نظر میں علم کا ایک ظرف تھے۔ (طبقات الحفاظ ا ص۱۶۰)
* قرۃ بن خالد سدوسی بصری متوفی ۱۵۴ھ۔ ان کی تقریباً سو حدیثیں ہیں جن سے اصحاب صحاح ستہ نے استدلال کیا ہے۔
* محمد بن المنکدر قرشی تیمی متوفی ۱۳۳ھ۔ ان سے بھی اصحاب ستہ نے استدلال کیا ہے۔ ابن عیینہ کی نظر میں صداقت کا معدن اور صالحین کا مرکز تھے۔ ذہبی کی نظر میں ان کی وثاقت و افضلیت پر اجماع ہو چکا ہے۔
* یحییٰ بن کثیر طائی یمانی متوفی ۱۲۹ھ۔ یہ شعبہ کی نظر میں زہری سے بہتر تھے اور ابو حاتم کے نزدیک خود بھی ثقہ تھے اور ثقہ ہی سے روایت کرتے تھے۔ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ (طبقات الحفاظ ا ص۱۳۱)

* زہری ابوبکر محمد بن مسلم متوفی ۱۲۴ھ ۔ ان سے مالک بن انس، ابن ابی ذئب، سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد اور اوزاعی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ یہ امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ دونوں کے شاگرد تھے ــــ (تہذیب الاسماء واللغات نووی ۱ ص۸۷)

* ربیعۃ الرائی متوفی ۱۳۶ھ ۔ امام مالک کے استاد، امام محمد باقرؑ کے شاگرد تھے (تاریخ اسلام ذہبی ۴ ص۲۹۹) اور صحاح ستہ کے معتبر راوی ہیں۔ ان سے اوزاعی، ثوری، سلیمان بن بلال وغیرہ نے روایت کی ہے۔

* اعمش سلیمان بن مہران کوفی متوفی ۱۴۸ھ ۔ رئیس مذہب، اعلم عصر اور صحاح ستہ کے راوی تھے۔ امام محمد باقرؑ کے مشہور شاگردوں میں تھے جیسا کہ جلد اوّل میں مذکور ہو چکا ہے۔

* عبداللہ بن ابی بکر انصاری متوفی ۱۳۵ھ ۔ مالک کے استاد، صحاح ستہ کے راوی نسائی کی نظر میں انتہائی ثقہ، مالک کے نزدیک مرد صداقت، کثیر الحدیث اور خود ابن سعد کی روایت کے مطابق ثقہ کثیر الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب ۵ ص۱۶۴، تاریخ الاسلام ۵ ص۳۶۴)

* زید بن علیؑ بن الحسینؑ متوفی ۱۲۳ھ ۔ انھوں نے اپنے والد اور اپنے بھائی امام باقرؑ سے روایت کی ہے اور ان سے زہری، اعمش، شعبہ، سعید بن خثیم، اسماعیل السدی، زکریا بن ابی زائدہ، عبدالرحمٰن بن حارث، وغیرہ نے روایت کی ہے۔ یہ ۱۲۲ھ میں شہید کئے گئے اور بقول مصعب زبیری ۱۲۶ھ تک ان کا جسم تختۂ دار پر لٹکا رہا۔ ابن ابی الدنیا نے محمد بن ادریس۔ عنکی۔ جریر بن حازم سے روایت کی ہے کہ انھوں نے رسول اسلامؐ کو اس درخت سے ٹیک لگائے ہوئے خواب میں دیکھا جس پر زید کا جسم معلق تھا اور آپ فرما رہے تھے کیا میری اولاد سے یہی سلوک ہوگا؟ (تہذیب التہذیب ۳ ص۴۲۰) زید بن علیؑ کی منزلت ائمہ معصومینؑ کی نظر میں بہت بلند ہے۔ فقہ میں آپ کی ایک کتاب "مجموعہ زید" کے نام سے مشہور ہے جسے جرفینی نے میلانو کے کتب خانہ میں تلاش کیا ہے۔

* موسیٰ بن سالم مولیٰ آلِ عباس۔ ان سے عطاء ابن سائب، لیث بن ابی سلیم، ثوری اور دونوں حمادوں وغیرہ نے روایت کی ہے۔ احمد، ابن معین، ابوزرعہ، ابوحاتم نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن عبدالبر نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کی وثاقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب ۱۰ ص ۳۴۴)

* ابو ہارون موسیٰ بن عیسیٰ الحناط المدنی۔ ان سے لیث بن سعد، ابن عیینہ، یحییٰ القطان وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اور نسائی و ابن حبان نے توثیق کی ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ نے ان کی روایتوں کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔

* قاسم بن فضل حدانی متوفی ۱۶۷ھ۔ ان کی حدیث بخاری نے "الادب المفرد" میں اور مسلم وغیرہ نے صحیح میں درج کی ہے۔ قطان و احمد نے توثیق کی ہے اور ابن مہدی، وکیع وغیرہ نے روایت کی ہے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۴ ص ۲۹۹)

* قاسم بن محمد بن ابی بکر تیمی مدنی متوفی ۱۰۱ھ۔ فقہاء سبعہ میں سے ایک اور صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ ابن سعد نے ان کو ثقہ، عالم، فقیہ، امام اور کثیر الحدیث مانا ہے۔

* محمد بن سوقہ۔ ان سے مالک بن مغول، ثوری، ابن المبارک، ابومعاویہ، عبدالرحمن بن محمد محاربی، اسماعیل بن زکریا، مروان بن معاویہ، ابوالمغیرہ، عطار بن مسلم، ابن عیینہ و علی بن عاصم واسطی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ محمد بن عبید کا کہنا ہے کہ میں نے ثوری کو ان کے بارے میں لفظ رضا استعمال کرتے سنا ہے۔ حسین بن حفص کی نظر میں ثوری انھیں بہترین انسان سمجھتے تھے۔ عجلی نے انھیں ثقہ، ابوحاتم نے صالح الحدیث، نسائی نے ثقہ مرضی، ابن حبان نے یکے از ثقات اور صاحب فضل و دین و عبادت قرار دیا ہے۔ دارقطنی کے نزدیک فاضل و ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۲۱۱) صحاح ستہ کے رجال میں تھے۔ ابن المدینی کے بیان کی بنا پر ان کی تیس حدیثیں ہیں۔ ابن عیینہ کی نظر میں یہ معصیت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔

* حجاج بن ارطاۃ نخعی قاضی کوفی متوفی ۱۴۵ھ۔ ان سے شعبہ، ہشیم، ابن نمیر، ہر دو حماد، ثوری، حفص بن غیاث، غندر، ابومعاویہ، یزید بن ہارون وغیرہ نے روایت کی ہے۔

بخاری نے الادب المفرد میں اور باقی اصحاب صحاح نے اپنی صحاح میں جگہ دی ہے۔
ابن عیینہ کا بیان ہے کہ میں نے ابن نجیح کو یہ کہتے سنا ہے کہ حجاج کا جواب دیکھا نہیں گیا ہے۔ ثوری نے ان پر اعتماد کو فرض کیا ہے اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ اپنے علوم پر ناظر تھے۔ عجلی کی نظر میں فقیہ اور کوفہ کے مفتی تھے۔ (تہذیب التہذیب ۲ ص ۱۹۶)

* معروف بن خربوذ کوفی۔ امام محمد باقرؑ کے راوی اور ان کے خواص میں سے تھے۔ ان سے وکیع، ابوداؤد طیالسی، ابوبکر بن عیاش، عبداللہ بن داؤد، ابوعاصم وغیرہ نے روایت کی ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے روایت درج کی ہے، ابن حاتم نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور ساجی نے صدوق کے لقب سے یاد کیا ہے۔ (خلاصہ ص ۳۲۷)
(یہ یاد رہے کہ یہ معروف کرخی کے علاوہ ایک بزرگ ہیں اس لئے کہ وہ امام رضاؑ کے صحابی تھے اور انھوں نے ۲۰۰ھ میں وفات پائی ہے۔)

ان لوگوں کے علاوہ علماء امت میں بے شمار ایسے افراد ہیں جنھوں نے امام محمد باقرؑ سے استفادہ کیا ہے یا ان کی روایتیں نقل کی ہیں۔ انھیں علماء میں سے :-

* امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی متوفی ۱۵۰ھ۔ جن کی امامؑ سے روایتیں ان کے فضائل و مناقب کی کتابوں میں درج ہوئی ہیں۔
* شیبہ بن نصاح قاری مدنی قاضی متوفی ۱۳۰ھ (التقریب لابن حجر ا ص ۲۰۷)
* اسلم منقری ابوسعید کوفی متوفی ۱۴۲ھ
* محمد بن اسحاق بن یسار ابوبکر مطلبی مدنی متوفی ۱۵۱ھ صاحب المغازی (تذکرۃ الحفاظ ا ص ۱۶۳)
* عبداللہ بن عطاء مدنی طائفی استاد اسحاق و شعبہ و ثوری۔ راوی صحاح ستہ۔
* عروہ بن عبداللہ بن قشیر جعفی۔ ان سے ثوری و زہیر بن معاویہ وغیرہ نے روایت کی ہے اور ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی نے اپنی صحاح اور شمائل میں ان کی روایت کو جگہ دی ہے۔ (الجرح والتعدیل ۳ ص ۱۹۷ قسم اوّل۔)
* عبداللہ بن حبیب ابن ابی ثابت اسدی کوفی۔ ان کی حدیث مسلم نے صحیح میں، نسائی

نے خصائص میں نقل کی ہے اور ان سے ثوری، وکیع، ابن المبارک وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں، ابن حجر نے تہذیب میں اور خزرجی نے خلاصہ میں ایسے افراد کی ایک کثیر تعداد نقل کی ہے جن کا تذکرہ طول کے خوف سے ترک کیا جا رہا ہے۔

شیعہ تلامذہ و رواۃ احادیث

* ابان بن تغلب ــــ ابوسعد کوفی ابان بن تغلب متوفی ۱۴۱ھ امام سجادؑ، امام باقرؑ، امام صادقؑ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔
امام باقرؑ نے آپ کو مسجد مدینہ میں بیٹھ کر فتویٰ دینے کا حکم دیا تھا۔
مسلم و ترمذی و نسائی و ابوداؤد و ابن ماجہ نے آپ کی روایتوں کو اپنے یہاں جگہ دی ہے۔
احمد و ابن معین و نسائی و ابوحاتم نے آپ کی توثیق کی ہے۔
ابن عدی کا کہنا ہے کہ آپ کے مختلف نسخے ہیں جو عموماً درست ہیں بشرطیکہ ان کی روایت کسی ثقہ نے کی ہو۔
آپ صادق القول، اور روایت میں قابلِ قبول تھے اگرچہ مذہبی اعتبار سے شیعہ تھے۔
ابن سعد نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ذہبی نے دہری وثاقت کا اعتراف کیا ہے۔ تفسیر و میراث و قرأت میں آپ کی تالیفات ہیں۔
امام صادقؑ سے تیس ہزار حدیثیں حفظ کی تھیں۔
(تہذیب التہذیب، لسان المیزان، میزان الاعتدال، الخلاصہ)

* برید بن معاویہ عجلی متوفی ۱۴۸ھ۔ امام باقرؑ و امام صادقؑ کے حواریین میں تھے اور انھیں دونوں حضرات سے روایت کی ہے۔

کشی کا بیان ہے کہ آپ کی تصدیق پر پورے عالم تشیع کا اتفاق ہے۔

علامہ حلیؒ کے نزدیک آپ ثقہ فقیہ، سربراہ اصحاب متفق علیہ شخصیت کے مالک تھے۔

ائمہ معصومینؑ نے آپ کی اس حد تک تعریف کی ہے جو وثاقت سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

داؤد بن سرحان کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میرے پدر بزرگوار کے اصحاب زرارۃ بن اعین، محمد بن مسلم، لیث مرادی، برید عجلی وغیرہ ہمارے لئے زندگی اور موت دونوں میں باعث زیب و زینت تھے۔

* **ابو حمزہ ثابت بن دینار ثمالی** ــــ امام سجادؑ، امام باقرؑ، امام صادقؑ سے روایت کی ہے اور امام کاظمؑ کے دور حیات تک زندہ رہے ہیں۔ انتہائی جلیل القدر اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ ان سے سفیان ثوری، شریک، حفص بن غیاث، ابواسامہ، عبدالملک بن ابی سلیمان، ابونعیم، وکیع، عبیداللہ بن موسیٰ نے روایت کی ہے جسے ترمذی، ابن ماجہ اور نسائیؒ نے خصائص علیؑ میں درج کیا ہے۔

ائمہ علیہم السلام نے ان کی مدح و ثنا کی ہے۔

انھوں نے ہی امام سجادؑ کی دعائے سحر کی روایت کی ہے جو انھیں کے نام سے مشہور ہے۔

* **جابر بن یزید بن الحارث الجعفی المتوفی ۱۲۸ھ** ــــ آپ سے شعبہ، ثوری، اسرائیل، حسن بن حی، شریک، مسعر، معمر، ابوعوانہ وغیرہ نے روایت کی ہے اور ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے اسے درج کیا ہے۔

ابن مہدی نے حدیث میں سب سے بڑا محتاط۔ ابن علیہ نے حدیث میں صدوق اور شعبہ نے بروایت یحییٰ بن ابی بکر اوثق الناس قرار دیا ہے۔

وکیع کا بیان ہے کہ دنیا کی ہر شے میں تشکیک ہو سکتی ہے لیکن جابر کی وثاقت میں شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔

ابن عبدالحکم کہتے ہیں کہ میں نے شافعی سے یہ سنا ہے کہ سفیان ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم نے جابر کے بارے میں کچھ کہا تو میں تمھارے بارے میں بھی زبان کھولوں گا۔

جابر کو ایک لاکھ حدیثیں حفظ تھیں۔ (تہذیب التہذیب ۲ ص۴۸)

جابر کے بارے میں ان کے معاصرین کے کلمات آپ کے سامنے ہیں۔ علماء کے خیالات بھی آپ نے سن لئے لیکن خدا برا کرے تعصب اور فرقہ واریت کا کہ عراق میں اہل حدیث و اہل رائے کا جھگڑا اٹھتے ہی جابر کی حدیثیں ناقابل قبول ہوگئیں۔ انھیں جھوٹا کہا جانے لگا۔ ان پر بے بنیاد حملے ہونے لگے اور اس طرح جابر کی شخصیت کو مجروح بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ ابوحنیفہ نے اپنی قیاس پرستی کی بنا پر جابر کو جھوٹا قرار دیا اور بقول ابویحیٰی الحمانی یہ اعلان کیا کہ جابر میرے ہر قیاس کے مقابلہ میں ایک حدیث پیش کر دیتا ہے لہذا اسے کاذب سمجھنا چاہیئے۔

کاش امام اعظم نے اپنی شخصیت پر پہلے ہی غور کر لیا ہوتا اور جابر کے بارے میں لب کشائی کی زحمت نہ فرماتے۔ ظاہر ہے کہ ابوحنیفہ فقط سات حدیثوں کے راوی تھے اور ان کے مقابلہ میں جابر کے پاس ایک لاکھ حدیثیں تھیں اس لئے ان کے ہر قیاس کے مقابلہ میں جابر کو حدیث پیش کر دینے کا حق تھا اور ابوحنیفہ کو اس بنیاد پر تکذیب کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

امام جعفر صادق نے جابر کے لئے دعائے رحمت اور مغیرہ پر لعنت کی ہے۔ صرف اسی بنیاد پر کہ جابر صادق الہجہ تھے اور مغیرہ کذاب۔

کشیؒ نے اپنے رجال میں ان کی تعریف میں چند حدیثیں نقل کی ہیں اور ان کی ایک اصل اور ایک تفسیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ (فہرست شیخ طوسی ص۴۵)

بہرحال اس دوران کے حالات اور جابر کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے اس بات سے کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ علماء رجال نے ان کی تکذیب و توہین میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ جابر امام باقرؑ کو وصی الاوصیاء سے تعبیر کرتے تھے اور زمانہ اہلبیتؑ کے بارے میں کوئی کلمہ خیر سننے کے لئے تیار نہ تھا۔

* **محمد بن مسلم بن ریاح کوفی ثقفی متوفی ۱۵۰ھ** ـــ انھوں نے امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے روایت کی ہے اور علماء شیعہ نے ان تک صحیح طریقہ سے پہنچ جانے والی ہر روایت کی صحت کو اجماعی قرار دیا ہے۔

صلاح و اطاعت و علم میں نمونۂ روزگار تھے۔

امام باقرؑ کی تیس ہزار حدیثیں حفظ تھیں اور امام صادقؑ کی سولہ ہزار۔

اربعمائۃ مسئلہ کے نام سے کتاب بھی تالیف کی ہے۔ عبداللہ بن ابی یعفور کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے عرض کی کہ آپ کے پاس ہر وقت پہنچنا ممکن نہیں ہوتا اور لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرتے ہیں تو میں کس سے معلوم کیا کروں؟ تو آپ نے فرمایا کہ محمد بن مسلم ثقفی۔ وہ تو میرے والد ماجد کے راوی اور معتبر راوی تھے۔ ایک مرتبہ محمد بن مسلم اور ابو کریبہ ازدی کو شریک قاضی کے پاس گواہی کے لئے بلایا گیا تو ابن ابی لیلیٰ نے یہ کہہ کر دونوں کی گواہی مسترد کر دی کہ یہ دونوں جعفری اور فاطمی ہیں۔ محمد بن مسلم نے یہ سن کر شریک سے کہا کہ افسوس تو نے ہم لوگوں کو ایسی بزرگ ہستیوں کی طرف منسوب کیا ہے جو ہم جیسوں کو قبول نہیں کرتیں اس لئے اگر وہ اس نسبت کو تسلیم کر لیں تو یہ ان کا ہمارے اوپر احسان ہوگا۔ شریک یہ سن کر مسکرا دیا اور کہنے لگا کہ مرد ہو تو تم جیسا ہو۔

ابو حنیفہ سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا گیا جو خود مرگئی ہو لیکن اس کے پیٹ میں بچہ زندہ اور متحرک ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ اسے محمد بن مسلم سے دریافت کرو وہ تمھیں صحیح بتاسکیں گے۔ شریک قاضی اس وقت محمد بن مسلم کے پاس موجود تھا جب اس عورت نے آکر یہ مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ مسئلہ امام محمد باقرؑ سے دریافت کیا گیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ شکم کو چاک کرکے بچہ کو نکال لیا جائے۔ یہ سن کر عورت نے کہا کہ ابو حنیفہ نے بھی آپ ہی کا حوالہ دیا تھا۔

ابن ابی لیلیٰ کے محمد بن مسلم کی شہادت کو مسترد کر دینے کے بعد امام جعفر صادقؑ نے ایک شخص کو اس کے پاس چند مسائل بتاکر بھیجا اور فرمایا کہ جب وہ جواب سے عاجز ہو جائے تو اس سے کہنا کہ تم نے کس بنیاد پر محمد بن مسلم کی شہادت کو رد کیا ہے جب کہ وہ قرآن و حدیث

کو تم سے بہتر جانتے ہیں۔
وہ شخص ابن ابی لیلیٰ کے پاس آیا۔ سوالات پیش کئے۔ وہ جواب سے عاجز رہ گئے تو قاصد نے امام جعفر صادقؑ کو پیغام پہنچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت سے ان کی گواہی قبول کی جانے لگی۔
محمد بن مسلم اپنی قوم کے نہایت ہی محترم اور مالدار آدمی تھے۔ مدینہ میں چار مہینہ قیام کیا اور امام محمد باقرؑ سے تحصیل علوم کرتے رہے۔

* **حمران بن اعین شیبانی کوفی** ـــ امام محمد باقرؑ و امام صادقؑ دونوں حضرات سے روایت کی ہے۔ امام باقرؑ تو ان کے بارے میں یہاں تک فرماتے تھے کہ حمران وہ مومن حقیقی ہیں جو کبھی اپنے ایمان سے پلٹ نہیں سکتے ہیں۔ یہ علوم قرآن و لغت و نحو و کلام و فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔
* **زرارہ بن اعین شیبانی کوفی** متوفی ۱۵۰ھ ـــ رجال شیعہ میں فقہ و کلام کے اعتبار سے شہرتِ تام رکھتے تھے۔ امام باقرؑ و صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ نجاشی کی رائے ہے کہ اپنے دور میں سرآمدِ روزگار تھے۔ قاری، فقیہ، متکلم، شاعر، ادیب اور مجموعۂ فضل و کمال تھے۔

ابو غالب کا بیان ہے کہ وجیہ، سفید رنگ اور باہیبت انسان تھے۔ نماز جمعہ کے لئے نکلتے تھے تو لوگ دم بخود ان کے جمال و جلال کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ سر پر سیاہ کلاہ، پیشانی پر سجدہ کا نشان، ہاتھ میں عصا اور جلالت کا مجسم شاہکار۔
مناظرہ و مباحثہ میں بے مثل و لاجواب تھے۔ کوئی شخص بحث کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ذوقِ عبادت نے اس میدان سے الگ کر دیا تھا اور شاگردوں نے اس محاذ کو سنبھال لیا تھا۔
جمیل بن دراج سے کہا گیا کہ آپ کی محفل بڑی بارونق و عظمت ہے تو انھوں نے کہا کہ زرارہ کے سامنے ہم لوگ بچے معلوم ہوتے ہیں۔ فیض بن مختار امام صادقؑ کی خدمت میں آئے اور آپ سے اختلافِ احادیث کے بارے میں سوال کیا تو اتفاق

سے زرارہ وہاں حاضر تھے۔ آپ نے ایک مفصل تقریر کے بعد فرمایا کہ اگر کبھی فہم حدیث میں دشواری پیدا ہو تو ان زرارہ سے دریافت کر لیا کرو۔

سلیمان بن اقطع کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارے ذکر اور ہمارے پدر بزرگوار کی حدیثوں کو صرف چار آدمیوں نے زندہ رکھا ہے۔ زرارہ، ابوبصیر مرادی، محمد بن مسلم، بزید بن معاویہ عجلی۔

زرارہ نے حقِ آلِ محمدؐ سے دفاع کے سلسلے میں وہ تمام مصائب و آلام برداشت کئے ہیں جو ایک ایسے انسان کو ایسے خطرناک موضوع پر برداشت کرنا چاہیئے تھے۔ دشمنوں نے ان کے خلاف اقوال مشہور کرنے شروع کر دیئے۔ ان کی طرف غلط باتیں منسوب ہونے لگیں اور ان باتوں کو امام جعفر صادقؑ تک پہنچا کر آپ سے استفسار بھی کر لیا گیا۔ آپ نے ایسے آدمی سے برأت و بیزاری کا اظہار فرما دیا۔ دشمنوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے فتویٰ کو زرارہ پر منطبق کر کے ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ آل زرارہ تک یہ اطلاع پہنچی تو حمزہ بن حمران امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی، حضور نے میرے چچا سے برائت کی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ میں نے ان عقائد کے قائل سے برائت کی ہے جو مجھ تک پہنچائے گئے ہیں۔ اور یہ بات میرے لئے ضروری تھی ورنہ مجھے عقائد باطلہ سے راضی شمار کیا جاتا۔

حسین بن زرارہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زرارہ کا سلام پہنچا کر یہ عرض کی کہ بابا نے دریافت کیا ہے کہ کیا حضور نے میرے بارے میں کوئی فتویٰ دیا ہے؟ لوگ اس قسم کی باتیں مجھ سے نقل کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے باپ سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں بخدا تمھارے لئے دنیا و آخرت کی نیکی کا طالب ہوں اور تم سے خوش ہوں۔

شیخ طوسیؒ فرماتے ہیں کہ زرارہ کے بہت سے تصانیف ہیں مثل کتاب الاستطاعۃ والجبر وغیرہ۔ ابن ندیم کا کہنا ہے کہ زرارہ فقہ و حدیث و کلام میں رجال شیعہ کے سر برآوردہ

حضرات میں سے ہیں۔ ان کی اولاد میں حسن بن زرارہ اور حسین بن زرارہ امام صادقؑ کے اصحاب میں ہیں۔

ان کے حالات کی تفصیل کے لئے کتب رجال کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اربابِ ذوق اس مطالعہ سے غفلت نہ فرمائیں۔

* **عبد الملکؒ بن اعین شیبانی کوفی** ـــــ ان سے دونوں سفیان وغیرہ نے روایت کی ہے اور بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائیؒ نے روایت نقل کی ہے۔

امام باقرؑ و امام صادقؑ دونوں کے راوی تھے۔ امام صادقؑ ان کی کافی قدر کیا کرتے تھے۔ جب آپ کو ان کی وفات کی خبر ملی تو آپ نے دعائے مغفرت فرمائی۔ یہ تابعین اور حافظین احادیث میں شمار ہوتے تھے۔

ابوحاتم کی رائے ہے کہ یہ خالص شیعہ تھے لیکن ان کی حدیث لکھی جائے گی۔ اس لئے کہ صادق اللہجہ تھے۔

ابن حجر کا قول ہے کہ عبد الملک صدوق شیعی تھے۔ (تقریب ص ۲۴۹)

چونکہ اس کتاب میں ہماری بناء اختصار پر ہے اس لئے ہم نے حضرت کے تمام راویوں کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا ہے اور نہ مؤلفین ہی کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ راویوں کی تعداد تقریباً ۲ سو اور مؤلفین کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ توفیق شامل حال رہی تو امام محمد باقرؑ کے حالات میں مستقل کتاب تالیف کرکے ان تفصیلات کو درج کیا جائے گا۔ شیخ طوسیؒ اور ابن ندیم نے آپ کی تفسیر کا بھی ذکر کیا ہے جسے زیاد بن منذر نے آپ سے روایت کیا ہے۔

مدرسۂ امام محمد باقرؑ

بنی امیہ کی مسلسل روک تھام کے باوجود امام محمد باقرؑ کے مدرسہ میں علماء و مفکرین کا اجتماع بڑھتا ہی رہا۔ حکومت کی خواہش تھی کہ لوگ آل محمدؐ کا ذکر خیر کبھی نہ کریں۔ چنانچہ مخالفت

پر انعامات و وظائف تقسیم ہو رہے تھے، موافقت پر سزاؤں کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تشنگان علوم و معارف برابر آپ کی خدمت میں آتے رہے۔ مصائب کا سامنا کیا، دشواریاں جھیلیں لیکن نصرتِ حق کی راہ میں ان چیزوں کو چنداں اہمیت نہ دی۔

امام محمد باقرؑ کا زمانہ سلطنت کے عروج و استحکام کا دور تھا لیکن آپ نے تبلیغ دین اور نشر حق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حکام جور کے خلاف آوازۂ حق بلند کر کے لوگوں کو دین سے متمسک ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ حکومت کی نیند حرام ہو گئی لیکن وابستگانِ درِ آلِ محمدؐ کا سلسلہ نہ ٹوٹ سکا۔ مدینہ نشر معارف کا مرکز اور ہر گھرانہ علوم و معارف کا مصدر بن گیا۔ مدینہ کی مرکزیت کا مٹانا حکومت کے بس کا روگ نہ تھا اور آلِ محمدؐ کی مرجعیت بھی مدینہ کی مرکزیت کا دوسرا نام بن گئی تھی۔ چنانچہ مکحول بن ابراہیم نے قیس بن ربیع سے روایت کی ہے کہ میں نے ابو اسحاق سے موزے پر مسح کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن ایک مرتبہ بنی ہاشم کے ایک بے مثل بزرگ محمد بن علیؑ سے ملاقات ہو گئی تو میں نے ان سے اس مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے اس کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ امیر المومنینؑ ایسا نہ کرتے تھے بلکہ فرماتے تھے کہ یہ بات حکمِ الٰہی کے خلاف ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے بھی اس طریقہ کو ترک کر دیا۔ قیس کہتے ہیں کہ اس قصہ کو سننے کے بعد سے میں نے بھی اس طریقہ کو ترک کر دیا۔

زرارہ کا بیان ہے کہ میں امام محمد باقرؑ کے پہلو میں تھا۔ حضرت رو بہ قبلہ بیٹھے تھے اور فرما رہے تھے کہ قبلہ کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔ اتنے میں بجیلہ کا ایک آدمی آ گیا اور اس نے کہا کہ کعب الاحبار کا کہنا ہے کہ کعبہ ہر صبح بیت المقدس کو سجدہ کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا اس قول کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا کہ سچ ہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تو بھی غلط کہتا ہے اور کعب بھی جھوٹا ہے۔ زرارہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو اس صراحت کے ساتھ کسی کو جھوٹا کہتے ہوئے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔

امام محمد باقرؑ جب مکہ تشریف لے جاتے تھے تو آپ کے گرد طلاب علوم کا ایک ہجوم

رہتا تھا۔ مسائل کے جوابات، حلال و حرام کی وضاحت کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک دن میں ہزار ہزار مسائل کے جوابات دیئے جاتے تھے۔

ہشام بن عبدالملک نے آپ کے گرد یہ اجتماع دیکھ کر اپنی شخصیت کے بارے میں خطرہ محسوس کیا اور حضرت کی شخصیت کو گرانے کے لئے یہ سوال بھیجا کہ لوگ قیامت کے دن سوال وجواب کے خاتمہ تک کیا کھائیں پئیں گے؟ حضرت نے فرمایا کہ لوگوں کا حشر ایک ایسی زمین پر ہوگا جس میں درخت اور نہریں سب کچھ ہوں گی اور حساب کے خاتمہ تک لوگ اسی میں سے کھاتے پیتے رہیں گے۔

ہشام نے یہ سنا تو خیال کیا کہ اب حضرت کی گرفت کا موقع مل گیا۔ اس نے فوراً کہلا بھیجا کہ حساب وکتاب کی مصیبت میں کھانے پینے کا ہوش کیسے رہے گا؟

حضرت نے فرمایا کہ قرآن تو جہنم والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اہلِ جنّت سے دانہ پانی کا سوال کریں گے تو اگر جہنم میں پہنچ کر یہ ہوش رہ سکتا ہے تو محشر میں کیوں نہیں رہ سکتا ہے؟

ایک شخص خوارج میں سے حضرت کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا کہ آپ کس کی عبادت کرتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا۔ خدا کی۔ اس نے کہا کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ ـــــ فرمایا بیشک لیکن فرق یہ ہے کہ اسے آنکھیں نہیں دیکھتیں بلکہ دل میں ایمان کے حقائق دیکھتے ہیں۔ وہ نہ قیاس سے پہچانا جاتا ہے نہ حواس سے اور نہ لوگوں کی شباہت سے۔ آیتوں سے اس کی صفت اور نشانیوں سے اس کی معرفت ہوتی ہے۔ وہ اپنے احکام میں ظلم نہیں کرتا ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہ سننا تھا کہ وہ شخص کہتا ہوا چلا کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کو کہاں رکھے گا۔

بصرہ سے عثمان اعمیٰ حضرت کی خدمت میں آئے اور پوچھا کہ حسن بصری کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے علم کو چھپایا ان کی بدبو سے اہلِ جہنم کو اذیت ہوگی تو کیا یہ صحیح ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ قاعدہ ہے تو مومن آل فرعون تو ہلاک ہی ہو جائے گا حالانکہ قرآن نے اس کے ایمان چھپانے پر اس کی مدح کی ہے۔

بہرحال حضرت کی شخصیت سے مرجع خلائق تھی۔ علماء اعلام عمرو بن عبید، طاؤس یمانی، حسن بصری، نافع غلام ابن عمر وغیرہ آپ سے استفادہ کرنے کی غرض سے برابر حاضری دیا کرتے تھے۔ دیگر فرقوں کے علماء وفضلاء مناظرہ کی غرض سے آیا کرتے تھے اور حضرت ان کو تشفی بخش جواب دے کر ان کے کفر ونفاق وشبہات کو رفع فرمایا کرتے تھے۔

حکمتیں

امام محمد باقرؑ کے حکمت آمیز کلمات بیشمار ہیں اور سب کا جمع کرنا اپنے موضوع سے باہر ہے۔ اس لئے نمونہ کے طور پر صرف چند حِکَم ومواعظ پر اکتفا کی جاتی ہے۔

* انسان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ دوسروں کے عیب کو دیکھے اور اپنے نقص کو نہ دیکھ سکے۔
* سخت ترین اعمال تین ہیں۔ ہر وقت اللہ کا ذکر، اپنے نفس سے انصاف اور اپنے برادر دینی سے مالی ہمدردی۔
* جب قاریِ قرآن کو دولت مندوں سے ہمدردی کرتے دیکھو تو سمجھو کہ وہ خود بھی دنیادار ہے اور جب اسے بادشاہوں کا ساتھی دیکھو تو جان لو کہ وہ چور ہے۔
* علم کے ساتھ حلم سے بہتر کسی چیز کا کوئی ضمیمہ نہیں ہے۔
* معاملات میں جہاں تک دوسرے سے بہتر سلوک کر سکو کرو۔
* جس کا ظاہر باطن سے بہتر ہو اس کے اعمال کا پلّہ ہلکا ہے۔
* سستی اور تندی سے بچو کہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے۔ جو سست ہوگا وہ حق نہ ادا کر سکے گا اور جو تند خو ہوگا وہ حق پر صبر نہ کر سکے گا۔
* تواضع کے معنی مجلس میں اپنی جگہ سے کم پر بیٹھنا، ہر ملنے والے کو سلام کرنا، صاحب حق ہو کر بھی حق پر جھگڑا نہ کرنا۔
* اللہ کی طرف سے دل وجسم پر یہ عذاب ہوتے ہیں۔ معیشت میں تنگی، عبادت میں سستی اور

سب سے بڑا عذاب سخت دلی ہے۔

* حیا و ایمان باہم رفیق ہیں۔ ایک جائے گا تو دوسرا ضرور چلا جائے گا۔
* زبان ہر خیر کی کنجی ہے۔ مومن کو زبان کی حفاظت اسی طرح کرنی چاہیئے جیسے سونے چاندی کو بچاتا ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خدا اس مومن پر رحم کرے جو اپنی زبان کو برائی سے بچائے اس لئے کہ یہ بات اپنے نفس پر صدقہ کے برابر ہے۔
* احتیاط، جدوجہد، سچائی، امانت داری تمہارا فرض ہے۔ امانت کسی کی ہو واپس کردو اس لئے کہ میں تو ابن ملجم کی تلوار کو بھی واپس کر دیتا اگر میرے پاس امانت ہوتی۔
* طالبِ حاجت نے تم سے اپنے چہرہ کی عزت نہیں بچائی تو تم حاجت پوری کرکے اپنی آبرو بچاؤ۔
* سستی دین و دنیا دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔
* عمل کی قبولیت معرفت سے ہے اور معرفت کی حقیقت عمل سے ہے۔ معرفت عمل کی طرف لے جاتی ہے اور معرفت کے بغیر عمل نہیں ہوسکتا ہے۔
* جس کی زبان سچی ہے اس کا عمل پاک ہے۔ جس کی نیت اچھی ہے اس کا رزق وسیع ہے اور جس کا اپنوں سے سلوک اچھا ہے اس کی عمر زائد ہوتی ہے۔
* دین و دنیا میں تین بزرگیاں ہیں۔ ظالم کو معاف کرنا، قطع تعلق کرنے والے سے میل جول رکھنا، جاہل کے مقابلہ میں حلم سے کام لینا۔
* "پست لوگوں کا اسلحہ بد کلامی ہے۔" شاعر نے بھی کہا ہے۔" امام باقر ابن امام صادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے کہ پست قوم کا اسلحہ بدزبانی ہے۔" (الاتحاف)
* حق کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔ دشمن سے الگ رہو۔ دوست سے بچتے رہو۔ فاجر کا ساتھ نہ دو اور نہ اسے اپنے راز بتاؤ۔ مشورہ صرف ان لوگوں سے کرو جو خدا سے ڈرتے ہوں۔
* نئے نئے مالدار سے حاجت طلب کرنا سانپ کے منہ میں چھپے ہوئے درہم پر نظر رکھنا ہے کہ تمھیں اس کی ضرورت بھی ہے اور اس سے خطرہ بھی ہے۔

* لوگوں سے وہ بات کہو جو اپنے بارے میں کہی جانی پسند کرو۔ اللہ بدزبان، بدکلام اور مومنین پر طعن و طنز کرنے والوں کو دشمن رکھتا ہے۔ حیادار، حلیم، پاک دامن اور عفیف کو دوست رکھتا ہے۔
* ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہوتا ہے لہذا اسے گالی نہ دے، رنجیدہ نہ کرے اور اس سے بدظنی نہ کرے۔

وصیتیں

وصیت برائے عمر بن عبدالعزیز

امام محمدؑ باقر، عمر بن عبدالعزیز کے پاس تشریف لے گئے تو اس نے کہا کہ حضور کچھ نصیحت فرمائیں؟ آپ نے فرمایا کہ میری نصیحت صرف یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو اپنا فرزند، جوانوں کو اپنا بھائی اور بزرگوں کو اپنا باپ سمجھو، بچوں پر رحم کرو، بھائیوں کے ساتھ صلہ رحم کرو، اور بزرگوں کے ساتھ نیکی کرو، نیکی کرو تو اسے مکمل اور دائمی بناؤ۔ (عین الادب والسیاستہ ابن ہذیل طراز خفاجی)

ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز مدینہ آیا تو امام محمد باقرؑ نے اس کے پاس جا کر یہ نصیحت فرمائی۔ دنیا ایک بازار ہے جہاں لوگ نفع، نقصان سب کچھ خرید لیتے ہیں، کچھ لوگ صرف نقصان کے خریدار ہوتے ہیں۔ یہ جب مر جاتے ہیں تو ان کی ملامت کی جاتی ہے اس لئے کہ انھوں نے آخرت کے لئے کچھ نہیں جمع کیا۔ ان کا مال ایسے لوگوں کو ملتا ہے جو ان کی تعریف نہیں کرتے ہیں اور وہ خود ایسے کے سامنے جاتے ہیں جو انھیں معاف نہیں کرتا ہے۔ ہمیں اپنے اعمال پر نظر رکھنی چاہئے۔ ایسی باتوں سے بچو اور دو چیزیں دل پر خصوصی نظر رکھو۔ جو چیزیں تمھارے ساتھ جانے والی ہیں انھیں مہیا کرو اور جن چیزوں کو ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتے ہو انھیں الگ کر دو۔ ایسی چیزوں کی طرف رغبت نہ کرو جن میں تمھارے پہلے والے غارت ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ وہ تم سے بھی جدا ہو سکتی ہیں۔ لوگوں کے لئے دروازے کھلے رکھو۔ دربانوں

کو سہولت سکھاؤ۔ مظلوم کے ساتھ انصاف کرو۔ ظالم کو رد کرو۔ جس میں تین باتیں پائی جائیں گی اس کا ایمان اللہ پر کامل ہوگا ایک یہ کہ خوشی اسے باطل میں نہ داخل کردے، دوسرے یہ کہ غصہ اسے حق سے باہر نہ کردے اور تیسرے یہ کہ اقتدار پاکر غیر کے مال پر قبضہ نہ کرے۔

وصیت برائے جابر بن یزید الجعفی

اپنے بارے میں لوگوں کی رائے کو غور سے دیکھ۔ اگر وہ بات تم میں پائی جاتی ہے تو سمجھو کہ لوگوں کی نظروں سے گر جانے سے بدتر پروردگار کی نگاہوں سے گر جانا ہے اور اگر اپنے اندر وہ عیب نہ پاؤ تو خیال کرو کہ تمہیں بغیر کسی زحمت کے ثواب مل گیا۔

یاد رکھو تم اس وقت تک میرے دوست نہیں ہو سکتے ہو جب تک نفس اتنا بلند نہ ہو جائے کہ تمام شہر والوں کی مذمت سے محزون نہ ہو اور تمام اہلِ وطن کی تعریف سے مسرور نہ ہو۔ اپنے نفس کو کتابِ خدا کے سامنے رکھو اگر اس کے راستے پر گامزن، اس کے منہیات سے پرہیزگار اس کے مرغوبات سے دلچسپی لینے والا پاؤ تو خوش ہو کہ اب کوئی برائی اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے اور اگر نفس کو قرآن کا مخالف پاؤ تو سمجھو کہ تم دھوکہ میں ہو۔ مومن نفس سے جہاد کر کے اس پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اس کی کجی کو دور کرتا ہے۔ خواہشات کا مقابلہ کرتا ہے۔ اللہ کی محبت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

عقل کی راہنمائی میں خواہشات کی زیادتی سے بچو۔ علم کے اشارہ پر نفس سے ڈرو۔ خالص اعمال کو آخرت کے لئے ذخیرہ بناؤ۔ طمع کے اسباب کو مایوسی سے قطع کردو۔ خود پسندی کے راستے کو نفس کی معرفت سے روک دو۔ ابلیس سے پرہیز کرو۔ جھوٹی امیدیں نہ کرو کہ اس سے سچا خوف پیدا ہوگا۔

لالچ کو مار کر عزت کو باقی رکھو۔ مایوسی کی عزت سے طمع کی ذلت کو دفع کرو۔ مایوسی کی عزت کو ہمت کی دوری سے حاصل کرو۔ دنیا سے تھوڑی امید رکھو۔ فرصت کے مواقع کو غنیمت شمار کرو۔

یاد رکھو! طلب سلامتی سے بہتر کوئی علم نہیں ہے اور دل کی سلامتی جیسی کوئی عقل نہیں

"بدترین ہمسایہ انسان کی کمر کو توڑ دیتا ہے۔ نیکی کو دیکھتا ہے تو چھپا دیتا ہے اور برائی کو دیکھتا ہے تو اچھال دیتا ہے۔"

عبدالملک بن مروان ابتدائی طور پر امام محمد باقرؑ اور دیگر افراد خاندان کو ایذا رسانی سے کنارہ کشی کرتا تھا اور لوگوں کو تعلیم دیتا تھا کہ ان کا خون بہانے سے بچو کہ آل ابوسفیان اسی میں تباہ ہوئے ہیں۔ (تاریخ یعقوبی ۳ ص۴۷)

لیکن ملک و مال کی لالچ نے اسے بھی اہلبیت رسولؐ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس کے پیشِ نظر ان کا بڑھتا ہوا وقار اور اپنی مٹتی ہوئی آبرو تھی۔

اس کی ایک ہوشیاری یہ تھی کہ وہ خفیہ طور پر امام سے مسائل دریافت کرتا تھا اور کام نکل جانے کے بعد آپ کے درپے آزار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہِ روم نے اسے ایک تہدید آمیز خط لکھا۔ عبدالملک خط دیکھ کر حیران ہو گیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ والیِ حجاز حجاج کو لکھا جائے کہ تم حضرت علیؑ بن الحسینؑ کو ایک خط اسی انداز سے لکھو دیکھیں وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ حجاج نے خط پاتے ہی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت نے جواب دیا پروردگار عالم کے لئے ہر روز کے تین سو ساٹھ لمحات ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ پہلے ہی لمحہ میں تیرے شر سے بچالے گا۔ حجاج نے عبدالملک کو یہی جواب لکھ کر روانہ کر دیا۔ (یعقوبی ۳ ص۴۷)

ایک مرتبہ بادشاہِ روم نے عبدالملک بن مروان کو یہ تہدید کی کہ دینار پر رسول اکرمؐ کا ذکر نامناسب طریقہ سے کیا جاتا ہے تو یہ بات عبدالملک کو بہت زیادہ گراں گذری اور اس نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ لوگ جواب دینے سے عاجز رہ گئے۔ (شذور العقود مقریزی ص۶) تو روح بن زنباع نے کہا کہ حضور کو اس کا حل معلوم ہے لیکن آپ قصداً چشم پوشی کر رہے ہیں۔ عبدالملک نے غصہ میں آکر پوچھا کہ آپ ہی بتائیے کہ وہ کون ہے جو اس مسئلہ کا حل نکال سکتا ہے؟ روح نے کہا کہ باقرِ اہلبیت پیغمبرؐ ـــــ عبدالملک نے کہا کہ یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ بات اختلافی ہے ـــــ یہ کہہ کر مدینہ کے عامل کو خط لکھا کہ حضرت محمدؑ بن علیؑ کو ایک لاکھ درہم سامانِ سفر کے لئے اور تین لاکھ مقامی اخراجات کے لئے دے کر احترام کے ساتھ میری طرف روانہ کر دو۔ آپ کے ہمسفر لوگوں کی سہولت کا بھی خیال رہے۔ یہ کہہ کر عبدالملک نے

بادشاہ روم کے سفیر کو روک لیا یہاں تک کہ امام باقرؑ تشریف لے آئے اور عبدالملک نے آپ سے یہ خبر بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو کوئی اہم کام نہیں ہے۔ اس لئے ایک تو پروردگار نے بادشاہ روم کو اتنی چھوٹ نہیں دی ہے اور دوسرے یہ کہ چند زرگروں کو بلا کر درہم و دینار پر سورۂ توحید نقش کرا دو تاکہ اختلاف کی جڑ ہی ختم ہو جائے۔

بہرحال امام محمد باقرؑ اپنے دور کے اعلم امت اور بنی ہاشم کے سید و سردار تھے۔ آپ کی زندگی خاموشی اور گوشہ نشینی کی زندگی نہ تھی بلکہ آپ کے علم و فضل کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ حکومت وقت آپ کے کمال سے ہمیشہ خوفزدہ رہتی تھی۔ اس کی روش تباہ کن اور اس کی پالیسی خطرناک ہوا کرتی تھی۔ آپ کو اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ اپنے علمی جہاد میں مصروف رہا کرتے تھے یہاں تک کہ ۱۱۴ھ میں زہر سے شہید کر دیئے گئے اور بقیع میں دفن ہو گئے۔

زندگی کے آخری لمحات میں امام جعفر صادقؑ کو وصیت فرمائی ـــــ "فرزند! عقل روح کی رہنما اور علم عقل کا راہبر ہے۔ عقل علم کی ترجمان ہے۔ علم باقی رکھنے والا ہے اور زبان بہکنے والی ہے۔ ہر ساعت عمر کا ایک حصہ کم ہوتا ہے۔ ایک نعمت دوسری نعمت کے فنا کے بعد ہی ملتی ہے۔ زیادہ امیدوں سے پرہیز کرو کہ اکثر لوگ اپنی امیدوں کو نہیں پہنچتے ہیں۔ بہت سے مالدار اپنا مال نہیں کھا پاتے۔ بہت سے مال روکنے والے اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ وصیت ہے جو مجھے میرے پدر بزرگوار نے وقتِ آخر فرمائی تھی۔"

"فرزند! کسی بیچارے پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے کہ سوائے خدا کے اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا ہے۔" (یعنی ہر مظلوم)

امام محمد باقرؑ نے پانچ فرزند چھوڑے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ جن کی وجہ سے آپ کی کنیت ابوجعفر تھی۔ عبداللہ افطح۔ عبداللہ۔ ابراہیم۔ علی۔ پہلے دو فرزندوں کی والدہ امّ فروہ بنت قاسم بن محمدؒ تھیں۔ بعد کے دو فرزندوں کی والدہ امّ حکیم بنت اسد تھیں اور

آخری فرزند کی والدہ امِ ولد تھیں۔

ایسے ہی ایک مقدس ماحول میں امام جعفر صادقؑ نے آنکھیں کھولیں اور ایسے ہی شفیق و معصوم باپ کی آغوش میں پرورش پائی۔ وحی کی منزل آپ کا مکان اور عصمت کی آغوش آپ کا گہوارۂ تربیت تھی۔ آیت تطہیر آپ کے کردار کی ضامن اور معدنِ رسالت آپ کی شرافت و نجابت کا شاہد تھا۔

امام صادقؑ
اور
عہدِ منصور

عہدِ منصور

سفاح کے بعد ۱۳۶ھ میں زمامِ حکومت اس کے بھائی ابو جعفر منصور کی طرف منتقل ہوئی۔ سفاح بظاہر بنی ہاشم کے حق میں بڑا مہربان تھا۔ ان کے ساتھ نرم دلی کا سلوک کرتا تھا اور بنی امیہ کی طرف سے وارد ہونے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں آگے آگے رہا کرتا تھا۔ علوئین اور عباسیین کے تعلقات بھی خوشگوار تھے۔ کینہ وبغض کے اسباب ناپید تھے اور حالات بڑی حد تک سازگار چل رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بنی عباس نے اولادِ علیؑ کی بیعت توڑ کر حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

منصور دوانیقی نے حکومت سنبھالتے ہی اولادِ علیؑ کو سخت مصائب و آلام کا نشانہ بنا دیا۔ ان پر ناقابلِ تصور قسم کے ستم ڈھانا شروع کر دیئے جیساکہ سیوطی کا بیان ہے کہ اولادِ علیؑ اور بنی عباس میں افتراق پیدا کرنے والا پہلا فتنہ گر منصور تھا۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۰۲

منصور کی ایک فطرت یہ بھی تھی کہ جس سے بھی بدظن ہو گیا اسے تکلیف پہنچانے کے درپے رہا کرتا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر وسیلہ کو مباح سمجھتا تھا اور اس راہ میں اپنے محسنوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ امام صادقؑ کے ساتھ اس کے برتاؤ کا خاکہ جلد اوّل میں پیش کیا جا چکا ہے جس میں پروردگارِ عالم نے آپ کو قدم قدم پر اس کے شر سے محفوظ رکھا اور اس کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ رہ گئی موت تو وہ انسان کا مقدر

ہے۔

۱۴۷ھ میں منصور نے حج کا ارادہ کیا کہ اسی بہانے امام صادقؑ کو گرفتار کرائے گا لیکن اس میں بھی ناکام رہا۔ (النجوم الزاہرہ اتابکی ۲ ص۶)

مورخین کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ منصور امام جعفر صادقؑ کو گرفتار بھی کر سکا یا ہمیشہ منصوبے بناتا رہا اور ناکام ہوتا رہا۔ بعض لوگوں نے اس گرفتاری کا تذکرہ کیا ہے جیسے سمط النجوم العوالی المعصامی المکی ۳ ص۲۳۹۔ لیکن اکثر حضرات نے ان تمام مظالم کو نظر انداز کر دیا ہے جو بنی عباس کی طرف سے اولادِ علیؑ پر نازل ہوا کرتے تھے۔

ہم اپنے فیصلہ کے لئے حسب ذیل روایات کا نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں منصور کے دربان ربیع کا بیان ہے کہ جب منصور کی حکومت مستقر ہوگئی تو ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ جعفرؑ بن محمدؑ کو میرے پاس بلاؤ۔

میں حضرت کے پاس گیا اور منصور کا پیغام پہنچایا۔ آپ میرے ساتھ اٹھ کر منصور کے پاس آئے۔ دروازہ کے نزدیک پہنچ کر ٹھہر گئے۔ آپ کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ اس کے بعد داخل دربار ہوئے۔ حاکم کو سلام کیا۔ اس نے کہا تشریف رکھئے۔ یہ کہہ کر عطردان منگایا۔ حضرت کے عطر لگایا اور کہا اب تشریف لے جائیے۔ اس کے بعد ربیع کو حکم دیا کہ امام کو جائزہ دو اور عام مقدار سے زیادہ دو۔

ربیع کہتا ہے کہ باہر نکل کر میں نے حضرت سے کہا کہ میں نے اب تک نہ ایسا کوئی منظر دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ آخر یہ آپ زیرِ لب کیا پڑھ رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے پدر بزرگوار سے آبا طاہرینؑ کے واسطے سے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ شدید امور کے پیش آنے پر یہ دعا پڑھی جائے۔

اللّٰھم احرسنی بعینک التی لا تنام واکفنی برکنک الذی لا یرام واحفظنی بعزک الذی لا یضام واکلأنی فی اللیل والنھار وارحمنی بقدرتک علی، انت ثقتی ورجائی، فکم من نعمۃ انعمت بھا علی قل لک بھا شکری وکم من بلیۃ ابتلیتنی بھا قل لک بھا صبری

وکم من خطیئۃ رکبتہا فلم تفضحنی فیا من قل عند نعمتہ شکری فلم یحرمنی ویا من قل عند بلائہ صبری فلم یخذلنی ویا من رآنی علی الخطایا فلم یعاقبنی، یا ذا المعروف الذی لا ینقضی ابدا، ویا ذا الایادی التی لا تحصی عددا ویا ذا الوجہ الذی لا یبلی ابدا، ویا ذا النور الذی لا یطفأ سرمدا اسئلک ان تصلی علیٰ محمد وآلِ محمد کما صلیت وبارکت وترحمت علی ابراھیم وان تکفینی شر کل ذی شر بک ادرء فی نحرہ واعوذ بک من شرہ واستعینک علیہ، اللّٰھم اعنی علیٰ دینی بدنیای وعلیٰ آخرتی بالتقویٰ واحفظنی فیما غبت عنہ ولا تکلنی الیٰ نفسی فیما حضرتہٗ، یا من لا تضرہ الذنوب ولا تنقصہ المغفرۃ اغفرلی فیما لا یضرک وھب لی مالا ینقصک، یا الٰھی اسئلک فرجا قریبا واسئلک العافیۃ من کل بلیہ واسئلک الشکر علی العافیۃ واسئلک دوام العافیۃ واسئلک غنی عن الناس ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، اللّٰھم بک استدفع مکروہ ما انا فیہ واعوذ بک من شرہ یا ارحم الراحمین۔ (عیون الادب والسیاسہ لابی الحسن بن ہذیل ص۱۶۳)

ایک دوسرا واقعہ ربیع ہی کی زبانی یہ نقل ہوا ہے کہ منصور نے چند شکایتوں کی بنا پر مجھے حضرت جعفر صادقؑ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ حضرت تشریف لے آئے تو دربان نے کہا کہ خدا آپ کو اس جابر کے شر سے بچائے۔ اس لئے کہ آج مجھے شدید خطرہ کا اندیشہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار پروردگار ہے۔ تم میرے لئے اجازت لے آؤ۔ اجازت ملی۔ آپ داخلِ دربار ہوئے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور آپ منصور کے سوالات کا جواب دیتے رہے یہاں تک کہ منصور کا غصہ فرو ہو گیا اور وہ حق وایمان کی طاقت کے سامنے یہ کہہ کر جھک گیا کہ میں نے آپ کو معاف کیا۔ اس لئے کہ آپ صادق اللہجہ ہیں۔ اب آپ کوئی ایسی حدیث بیان فرمائیں جس سے میں استفادہ کر سکوں اور مہلکات سے نجات پاؤں۔ حضرت نے فرمایا کہ "بردباری سے کام لو کہ یہ علم کا ستون ہے۔ قدرت رکھنے کے

بعد نفس پر قابو رکھو کہ اختیارات سے برمحل کام لینا نفس کی آگ بجھانے اور کینہ و بغض کا مداوا کرنے کے مرادف ہے۔ ایسا آدمی صولت و شکوہ سے اپنی شہرت چاہتا ہے۔ اگر کسی مستحق کو سزا دو تو اسی انداز سے کہ عدل کا نام باقی رہے۔ شکر کے حالات صبر کے اسباب سے بہتر ہوتے ہیں۔"

منصور یہ سن کر مدہوش ہو گیا اور کہنے لگا کہ حضور نے بہترین موعظہ فرمایا ہے اور بے نظیر ایجاز سے کام لیا ہے۔

منصور کا ایک دستور یہ تھا کہ جب بھی مدینہ آتا، اس کے پیش نظر صرف حضرت کو اذیت پہنچانا اور آپ کو طرح طرح کے الزامات سے ملوث کرنا ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت خدائی وعدہ پر اعتماد کر کے کبھی اس کی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے۔

ایک مرتبہ مدینہ کے دوران قیام اس نے ربیع کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ تنہائی میں حضرت صادقؑ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ منصور نے تمھیں سلام کہا ہے اور اسی وقت یاد کیا ہے۔ اگر وہ آنے پر تیار ہو جائیں تو لیتے آؤ اور اگر کوئی عذر کریں تو انھیں سے وقت مقرر کراؤ۔

ربیع کہتا ہے کہ میں ایسا ہی وقت تلاش کر کے حضرت کے یہاں پہنچا۔ دیکھا کہ آپ کا سر سجدہ میں ہے، رخسار خاک پر، چہرہ و رخسار پر خاک پڑی ہوئی ہے، دعاؤں میں مشغول ہیں۔ میں نے ایسے ہنگام میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ آپ کی نماز تمام ہو گئی اور آپ میری طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے سلام کیا۔ حضرت نے جواب سلام دیتے ہوئے ورود کا سبب دریافت کیا۔

میں نے واقعہ بیان کیا۔ آپ نے برجستہ آیت پڑھی "کیا صاحبان ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ وہ ذکر خدا کے سامنے جھک جائیں اور ان اہل کتاب کی مانند نہ بنیں جن کی مدت مہلت دراز ہوتی رہی اور ان کے دل سخت ہو گئے۔"

ربیع! کیا اہل قریہ اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ ان پر سوتے سوتے عذاب نہ نازل ہو جائے گا۔ کیا انھیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ ان کے کھیلتے کھیلتے دن دہاڑے ان پر

عذاب نازل ہو جائے۔ کیا وہ عذاب خدا سے بے خوف ہو گئے ہیں جب کہ اس کے عذاب سے بیخوف بننے والے لوگ صرف خسارہ میں رہیں گے"۔

یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ منصور سے میرا سلام کہہ دینا اور پھر اپنی نماز میں مشغول ہو گئے۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ نماز کے بعد آپ نے توجہ فرمائی۔

میں نے عرض کی کہ سلام کے علاوہ کچھ اور بھی فرمائیں گے ؟

آپ نے آیت پڑھی "کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے ہم سے روگردانی کی اور تھوڑا ہی ساماں دیا۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے ؟"

ربیع ! اس سے کہہ دینا کہ تم نے بار بار ہمیں خوفزدہ کیا یہاں تک کہ ہماری عورتیں بھی خائف ہو گئی ہیں۔ اس لئے اب ہماری اذیت سے باز آؤ ورنہ ہم روزانہ پانچ مرتبہ تمھارے لئے بد دعا کریں گے اور رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ چار قسم کی دعائیں مسترد نہیں ہوتیں :-

باپ کی دعا بیٹے کے لئے۔

ایک بھائی کی دعا دوسرے بھائی کے لئے اس کی عدم موجودگی میں۔

مظلوم کی دعا۔

مخلص کی فریاد۔

ایک مرتبہ منصور نے محمد بن الربیع کو حضرت امام جعفر صادقؑ کے پاس یہ حکم دے کر بھیجا کہ حضرت جس حالت میں بھی ہوں انھیں اپنے ساتھ لے کر آؤ اور اس کام کے لئے بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ دروازہ کھولے بغیر دیوار کی طرف سے جاؤ تاکہ آپ اپنی حالت کو تبدیل نہ کر سکیں۔

محمد کہتا ہے کہ میں حسب الحکم منصور گیا۔ دیکھا کہ حضرت نماز میں مشغول ہیں۔ نماز تمام ہوئی تو میں نے عرض کی کہ امیر المومنینؑ کے پاس چلئے۔

آپ نے فرمایا۔ ٹھہرو ذرا کپڑے پہن لوں۔

میں نے کہا کہ یہ غیر ممکن ہے اور یہ کہہ کر آپ کو اسی حالت میں منصور کے پاس لے آیا۔

منصور نے آپ کو دیکھتے ہی یہ کہنا شروع کیا کہ اے جعفر تم اپنے بغض و حسد اور بنی عباس کے خلاف بغاوت سے باز نہ آؤ گے۔ یاد رکھو کہ تمھارا حسد بڑھتا جائے گا لیکن تمھارا مقصد نہیں

حاصل ہوسکتا (معاذاللہ)۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے تو بنی امیہ کے دور میں بھی زندگی گذاری ہے جو میرے اور تمھارے بدترین دشمن تھے۔ اور میں نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ بلکہ ان کے مظالم کو برداشت ہی کرتا رہا۔ تو اب ایسے اقدامات کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ تم تو میرے قرابتدار اور ابن عم ہو۔

منصور نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور تکیہ کے نیچے سے ایک فائل نکال کر حضرت کے سامنے پھینک دی۔ کہنے لگا یہ آپ کے خطوط ہیں جو آپ نے اہل خراسان کو میرے خلاف بغاوت کے لئے لکھے ہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ خدا کی قسم یہ میرے خطوط نہیں ہیں۔ اب تو میری ضعیفی آگئی ہے۔ مجھ میں ایسے کاموں کی سکت کہاں۔ بہتر یہی ہے کہ تو مجھے قید خانہ ہی میں ڈال دے یہاں تک کہ میں مرجاؤں۔ اس لئے کہ میری موت قریب آچکی ہے۔

منصور نے کہا یہ کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ اور یہ کہہ کر نیام سے تلوار کھینچی۔ پھر کچھ سوچ کر رکھ دی اور کہنے لگا ـــــ جعفر اس ضعیفی میں بھی تم کو شرم نہیں آتی۔ تم غلط بیانی سے کام لے کر مسلمانوں میں اختلاف پھیلانا چاہتے ہو۔ رعایا اور حکام کو لڑوا کر خونریزی کرانا چاہتے ہو۔ (معاذاللہ)

حضرت نے فرمایا خدا کی قسم یہ میرا کام نہیں ہے۔ نہ یہ میرے خطوط ہیں۔ نہ میری تحریر ہے اور نہ میری مہر ہے۔

منصور نے ایک نہ سنی اور برابر عتاب کرتا رہا۔ حضرت معذرت فرماتے رہے۔ آخر کار منصور نے سر اٹھا کر کہا کہ آپ سچے معلوم ہوتے ہیں۔ (بحار جلد ۱۲)

عبداللہ ابن ابی لیلیٰ راوی ہیں کہ میں ربذہ میں منصور کے ساتھ تھا کہ منصور نے ایک شخص کو امام صادق کے بلانے کے لئے بھیجا۔ حضرت آئے۔ جیسے ہی منصور نے آپ کے آنے کی خبر سنی حکم دیا کہ انھیں قتل کر دو۔ خدا مجھے قتل کرے اگر میں انھیں زندہ چھوڑ دوں اور اس کے بعد چند بدمعاش لوگوں کو مسلط کر دیا۔

حضرت ان کے حلقے میں دربار کی طرف چلے۔ دروازہ پر پہنچ کر کچھ دعا پڑھی اور داخل دربار ہوگئے۔ جیسے ہی منصور نے آپ کو دیکھا کہنے لگا۔ ابنِ عم مرحبا، فرزندِ رسول! مرحبا۔ اور یہ کہہ کر

آپ کو مسند پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت باہر تشریف لے گئے تو ابن ابی لیلیٰ نے پوچھا کہ حضور نے کیا دعا پڑھی تھی؟ آپ نے فرمایا ـــــ ماشاء اللہ لا یاتی بالخیر الا اللہ، لا یصرف السوء الا باللہ، ماشاءَ اللہ ماشاء اللہ کل نعمۃ فمن اللہ ماشاء اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

صفوان بن مہران جمال راوی ہیں کہ بنی مخزوم کے ایک شخص نے منصور کے پاس یہ شکایت کی کہ جعفرؑ بن محمدؑ، معلی بن خنیس کو اپنے شیعوں کے پاس بھیج کر ان سے مال جمع کرتے ہیں اور اسے محمد بن عبداللہ کی نصرت پر صرف کرتے ہیں۔

منصور یہ سن کر آگ بگولا ہوگیا اور امیر مدینہ کو خط لکھا کہ جعفر بن محمدؑ کو فوراً روانہ کر دے۔ راستہ میں کہیں قیام یا آرام کی بھی اجازت نہ دی جائے۔

حضرت کو اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے لئے سواری کا انتظام کر دو۔ میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔ رات گذری۔ سواری کا انتظام ہوا۔ حضرت عراق کی طرف روانہ ہوئے منصور کے پاس پہنچے۔ اجازت ملی۔ تشریف لے گئے ـــــ منصور نے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ احترام سے بٹھایا۔ اپنی شکایت بیان کی۔ حضرت نے فرمایا کہ پناہ بخدا۔ میں! اور ایسا کام ـــــ؟

منصور نے کہا آپ قسم کھا سکتے ہیں؟ میں ابھی اس شخص کو بلاتا ہوں جس نے یہ شکایت کی ہے۔ اور یہ کہہ کر حکم دے دیا۔ وہ شخص حاضر کیا گیا۔ اس نے حضرت کے سامنے بھی اپنی باتوں کو دہرایا۔ آپ نے فرمایا کہ تو قسم کھا سکتا ہے؟ اس نے کہا یقیناً اور یہ کہہ کر قسم شروع کر دی۔ حضرت نے فرمایا کہ جلدی نہ کر جیسے میں کہوں اس طرح قسم کھا۔ اس نے قسم کھائی اور فوری انتقام خدا کا شکار ہوگیا۔

محمد بن عبداللہ اسکندری کہتے ہیں کہ میں منصور کے مصاحبین میں تھا۔ ایک دن حاکم کے پاس گیا تو اسے کچھ مغموم پایا۔ میں نے سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اولاد فاطمہ میں سے تقریباً سو آدمی قتل کر دیئے ہیں لیکن ان کا سید و سردار ابھی تک باقی ہے۔

میں نے عرض کی کہ وہ کون ہے؟

اس نے کہا جعفر صادقؑ۔

میں نے کہا کہ وہ تو ایک عبادت گذار آدمی ہیں۔ انھیں ریاست و حکومت سے کیا واسطہ ہے؟

منصور نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی ان کی خلافت و امامت کے قائل ہو لیکن یاد رکھو کہ ملک بانجھ عورت کے مانند ہوتا ہے۔ میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ رشتہ و قرابت کوئی شے نہیں ہے اور آج شام تک اس کا فیصلہ کر دوں گا۔

یہ کہہ کر جلاد کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ جب میں جعفر بن محمد کو طلب کروں اور انھیں باتوں میں مشغول کر کے ٹوپی اتار لوں تو تم ان کی گردن اڑا دینا۔!

اس کے بعد حضرت کو طلب کیا اور خود آگے پیچھے چلتا رہا۔ تخت پر لا کر احترام سے بٹھایا اور کہا کہ اپنی ضرورت کو بیان کرو۔

حضرت نے فرمایا کہ میری حاجت صرف یہ ہے کہ آپ مجھے نہ طلب کیا کریں ــــ منصور یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ (بحار ۱۱ صـ۱۲۴)

مذکورہ بالا واقعات و حوادث سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

۱۔ امام جعفر صادقؑ سے منصور کی عداوت کسی قدیم خاندانی اختلاف کی بنا پر نہیں تھی۔ وہ سختی کے ایام میں امام کی طرف رجوع کرتا تھا۔ آپ سے حدیثیں سنتا تھا اور اولاد علیؑ کی حمایت میں نفس زکیہ محمدؐ کی طرف دعوت دیا کرتا تھا۔ بنی امیہ کے خلاف اقدام میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ درحقیقت اس اختلاف کا سرچشمہ اپنے اقتدار کا تحفظ تھا۔ چنانچہ منصور کی روش تختِ حکومت پر قدم رکھتے ہی بدل گئی۔ اس کے پیش نظر یہ خطرہ تھا کہ حمایت آلِ محمدؐ کے نام پر حاصل کیا ہوا ملک کسی وقت بھی اہلبیتؑ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس نے چاہا کہ ایسی عظیم ہستیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے جو میرے اقتدار کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہوں۔

امام صادقؑ کی حیثیت اس دور میں ایک مرجع عام کی تھی۔ اس لئے منصور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی ایک آواز سارے ملک میں انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ ان کا ایک ایک کلمہ میرے خلاف ایک محاذ کی تشکیل کر سکتا ہے۔ حکومت خود فی الحال ان احتجاجات کی

سکت نہیں رکھتی ہے۔ اس لئے خفیہ اقدام ہی زیادہ مناسب رہے گا۔ اس نے اسی فکر کے پیشِ نظر کئی مرتبہ امام کے قتل کا ارادہ کیا لیکن امام کی دور اندیشی اور انجام بینی اس اقدام میں حائل ہوتی رہی۔

۲۔ امام کے خلاف ایک پوری فائل کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ بنی عباس کے دربار میں ایسے پورے گروہ کا عمل دخل تھا جو امام کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح جعل و فریب کر کے منصور کو امام سے بدظن کر دیا جائے اور اس طرح فتنہ کی آگ میں آلِ رسولؐ کے صحیفۂ وقار کو جلا دیا جائے۔ منصور اس سازش سے پوری طرح باخبر نہ تھا اس لئے بعض اوقات امام سے اس لہجہ میں گفتگو کرتا تھا جو ایک جاہل اور ناواقف ہی استعمال کر سکتا ہے۔

میرے خیال میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان خطوط کی پشت پر خود منصور کی مکاری کام کر رہی ہو۔ لیکن یہ بہرحال کہا جائے گا کہ کچھ لوگ حکومت میں رخنہ ڈالنے اور ملک میں انتشار پیدا کرنے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ انھیں اہلبیتؑ کی عظمت اور ان کی طرف سے لوگوں کی محبت و عقیدت کا بھی علم تھا اور حکومت کی واقعی قوت کا بھی اندازہ تھا ــــ لیکن قدرت اپنے بندہ کے تحفظ کا اہتمام بھی کر رہی تھی۔ چنانچہ حکومت اور حکومت والوں کا کوئی حربہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۳۔ صفوان جمال کی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے بغداد میں بھی افادات فرمائے ہیں۔ چنانچہ جسر قدیم کے پاس بغداد کے مغرب میں ایک مکان حضرت کے مدرسہ کے نام سے تھا جس کے نشانات اب مٹ چکے ہیں۔ (حیات الامام الصادق للشیخ المظفر) لیکن افسوس کہ خطیب بغدادی نے تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور یہ بات تعجب خیز بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ خطیب اس دور کے مؤلف ہیں جس دور میں ایسے تمام مظالم اور اس قسم کی تمام خیانتیں روا تھیں۔

۴۔ منصور اپنے مکمل انحراف و بغض کے بعد بھی امام جعفر صادقؑ کی شخصیت سے ناواقف نہ تھا بلکہ اسے حضرت کی عظمت و اہمیت کا کامل علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے پہلے

ساری امکانی قوتیں آپ کو خوش کرنے پر صرف کیں اور جب کوئی تدبیر کامیاب نہ ہو سکی اور آپ مسلسل حکومت سے کنارہ کشی اور بے تعلقی کا اعلان کرتے رہے تو اس نے آپ کے اعزا و اقربا کو قتل کرنا شروع کر دیا جس میں آپ کے چچا عبداللہ ابن علی بھی تہ تیغ ہو گئے۔ جیسا کہ مسعودی کا بیان ہے کہ منصور نے عبداللہ بن علی کو ابوالازہر مہلب بن ابی عیسیٰ کے حوالے کر دیا اور وہ اسی کی قید میں رہے یہاں تک کہ ان کے قتل کا حکم نافذ ہو گیا اور ابوالازہر ان کے پاس اس وقت وارد ہوا جب ان کے پاس ایک کنیز بھی موجود تھی۔ ابوالازہر نے پہلے عبداللہ کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر جب آپ کی روح جسم سے نکل گئی تو کنیز کی طرف رخ کیا۔ اس نے کہا کہ میرے لئے کوئی دوسرا طریقہ تجویز کیجئے۔ ابوالازہر کہتا ہے کہ مجھے اس التماس پر رحم آگیا اور میں نے منہ پھیر لیا لیکن دوسرے آدمی کو حکم دے کر اسے پھانسی دلوا دی اور دونوں کو ایک بستر پر لٹا دیا۔ (مروج الذہب ۲ صـ۲۳۰)

۵۔ مذکورہ بالا روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصور اپنے ظاہری رعب و داب اور جاہ و حشم کے باوجود حضرت کی ہیبت و جلالت سے برابر خائف رہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ بارگاہِ احدیت میں مقرب ہیں۔ آپ کی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ہر مشکل اور مصیبت کے موقع پر مناجات کیا کرتے تھے اور آپ کی مشکلیں آسان ہو جایا کرتی تھیں۔ منصور نے اس بات کا مشاہدہ بھی کیا تھا کہ جب آپ نے ابن عیاش کلبی کے بارے میں سنا کہ وہ حضرت زید کی شہادت پر فخریہ انداز سے شعر پڑھتا پھر رہا ہے اور عثمان کو حضرت علیؑ پر ترجیح دیتا ہے تو اس کے لئے بددعا فرمائی کہ خدایا اگر یہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے تو اس پر اپنے کتے کو مسلط کر دے۔ چنانچہ ادھر حکیم باہر نکلا اور ادھر شیر نے اسے چیر پھاڑ کر برابر کر دیا۔ (اصابہ ۱ صـ۲۹۵)

امام جعفر صادقؑ اور حکام

امام کی زندگی میں منصور کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حکام سے مختلف مواقف پیش آئے ہیں جہاں ان حکام نے اپنے رئیس کو خوش کرنے کے لئے آپ کو اذیت دینے کی انتھک

کوشش کی ہے۔

ایک والیٔ مدینہ نے تو امام کی موجودگی میں جمعہ کا خطبہ پڑھا اور حمد خدا کے بعد حضرت علیؑ کو برا بھلا کہا۔ حضرت یہ سن کر کھڑے ہوگئے اور حمد باری اور صلوات کے بعد فرمایا کہ تو نے جس خیر کا ذکر کیا ہے اس کے اہل ہم لوگ ہیں اور جن برائیوں کا تذکرہ کیا ہے اس کا اہل تو اور تیرا رئیس ہے۔

ذرا اپنے حالات کا جائزہ لے۔ دوسرے کے دم خم پر کب تک؟ آخر ایک دن پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ یہ گناہ تجھے ہی لے جانا ہوگا۔

اس کے بعد آپ نے قوم سے خطاب کرکے فرمایا۔ "یاد رکھو قیامت کے دن سب سے زیادہ خالی میزان اور سب سے زیادہ خسارہ میں رہنے والا انسان وہ ہوگا جس نے آخرت کو دنیا کے عوض بیچ ڈالا اور وہ یہی فاسق ہے۔

والیٔ شہر یہ سن کر دم بخود ہوگیا اور مسجد سے باہر چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اہم حادثات منصور سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ جاسوس برابر امام کے نقل و حرکت کی اطلاع پہنچا رہے تھے اور منصور اپنے انتقام کی تدبیروں میں مصروف تھا۔

داؤد بن علی مدینہ کا والی مقرر ہوا تو اس نے بھی علویوں کو اذیت پہنچانا شروع کی۔ سیرافی کے ذریعہ معلیٰ بن خنیس کو شہید کرا دیا جو امام کے خاص اصحاب اور موالی میں سے تھے۔ ان کے اموال پر قبضہ کرلیا لیکن انھوں نے سب کچھ برداشت کرلیا۔

حضرت معلیٰ بن خنیس کے قتل کے چند اسباب بیان کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ داؤد نے ان سے شیعیانِ علیؑ کی سراغ رسانی کا تقاضا کیا اور انھوں نے انکار کردیا اور اپنے انکار پر آخر وقت تک قائم رہے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔

۲۔ انھوں نے محمد بن عبداللہ صاحب نفس زکیہ کے اقدام میں ان کا ساتھ دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضرت کو اس حادثہ سے سخت تکلیف پہنچی اور آپ نے اسے اپنے حق پر ایک سنگین حملہ تصور کیا۔ چنانچہ خبر کو سنتے ہی آپ خلافِ عادت امیر کے پاس

گئے اور غضب ناک لہجہ میں خطاب فرمایا "تو نے میرے چاہنے والے کو قتل کیا ہے۔ میرے مال کو غصب کیا ہے۔ تجھے یہ نہیں معلوم کہ اولاد کے مرنے پر صبر ہو سکتا ہے لیکن جنگ کے اعلان پر خاموشی نہیں اختیار کی جا سکتی ہے۔ (گویا حضرت نے معلیٰ کے قتل کو اپنے حق میں اعلانِ جنگ تصور کیا تھا۔) اس کے بعد آپ سے اور امیر سے سخت لہجہ میں گفتگو ہوئی۔ امیر نے ساری ذمہ داری سپاہی کے سر ڈالنا چاہی لیکن جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تو سپاہی کے قتل کا حکم دے دیا۔

اس نے حکم سنتے ہی کہا "یہ خوب ہے کہ پہلے لوگوں کے قتل کا حکم دیں اور جب انھیں قتل کر دیا جائے تو سزا کے طور پر اپنے قتل کا حکم بھی نافذ ہو جائے"۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معلیٰ کے قتل میں تمام تر داؤد کا ہاتھ تھا اور سپاہی پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔

(ابن فوطی)

کافی کی روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت نے پروردگار عالم کو اس کی نورانیت، عزت، نعمت، سلطنت اور اس کے عزائم کا واسطہ دے کر داؤد کے لئے بددعا کی اور ابھی آپ کی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ داؤد کے گھر سے رونے کی آواز بلند ہوگئی معلوم ہوا کہ داؤد نے دنیا سے رحلت کی۔

امام نے جن سخت حالات میں زندگی گذاری ہے ان کا اندازہ آپ کے اس ایک فقرہ سے ہو سکتا ہے "سلامتی اتنی نادر ہو گئی ہے کہ اب اس کی جگہیں نظر نہیں آتیں"۔

سفیان ثوری کا دستور تھا کہ وہ حضرت کی خدمت میں برابر آیا کرتے تھے لیکن جب آپ پر سختیاں زیادہ ہونے لگیں تو سفیان نے بھی آنا کم کر دیا۔ ایک دن اتفاق سے حضرت کی خدمت میں آ گئے اور حدیث سننے کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم بادشاہ کے مطلوب ہو اور میں بادشاہ سے پرہیز کرتا ہوں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ تم چلے جاؤ۔ میرا مقصد تمھیں بھگانا نہیں ہے"۔

بنی امیہ کے حکام سے کہیں زیادہ مصائب حضرت کو منصور کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑے۔ اس نے بار بار آپ کے قتل کی تدبیر کی لیکن پروردگار کی مخصوص عنایت اور توجہ کی بنا پر آپ کو نجات ملتی رہی۔

علی بن میسرہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صادقؑ منصور کے پاس آئے منصور نے آپ کے سر پر ایک غلام مقرر کر دیا کہ جیسے ہی جعفر بن محمدؑ بیٹھیں ان کا سر قلم کر دینا۔
حضرت نے دربار میں قدم رکھتے ہی منصور کے تیور دیکھے اور زیر لب دعا کی: "اے ساری خلقت کے کام آنے والے مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھنا"۔
دعا مستجاب ہوئی اور آپ کو اس کے شر سے نجات مل گئی۔ (کافی ۲ ص ۵۶۱)
امام منصور کے مکر و فریب سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہ آپ کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لئے مختلف وسائل اختیار کر رہا ہے۔ کبھی اولاد علیؑ کے پاس لوگوں کو مال دے کر بھیجتا کہ اپنے کو خراسانی ظاہر کر کے انھیں مال دے اور ان سے رسید لے لے جیسا کہ ایک دفعہ خود امام صادقؑ کے پاس ایک شخص کو کافی رقم دے کر بھیجا۔ حضرت اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ آپ نے نماز ختم کرتے ہی فرمایا: "اے شخص خدا کا خوف کر اور منصور سے بھی کہہ دے کہ خدا سے ڈرے اور ہم اہلبیتؑ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرے۔ ہم نے بنی مروان کا دور دیکھا ہے اور یاد رکھ کہ سب اللہ کے محتاج ہیں"۔ (ابن شہر آشوب ۲ ص ۴۰۲)
کبھی شیعوں کے نام سے جعلی خطوط حضرت کے پاس بھیجا کرتا تھا کہ آپ کے جواب سے آپ کی گرفت کر سکے لیکن ظاہر ہے کہ خدائی بصیرت رکھنے والے افراد کہیں ایسی چالوں میں آیا کرتے ہیں۔
منصور اپنے ارادوں میں ناکام ہوتا رہا اور لوگ اپنی چغل خوری میں ناکام ہوتے رہے۔ خالق کائنات کی عنایتیں آپ کے ساتھ تھیں۔ ظالموں نے جعل و فریب کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آپ کی طرف سے شیعوں کو خطوط لکھے۔ انھیں حکومت کے خلاف بغاوت کی دعوت دی۔ مال بھیجا، دیگر تدبیروں سے کام لیا، لیکن ہر وقت ناکام رہا۔ اس کے ذہن میں ہمہ وقت ایک انقلاب کا تصور رہتا تھا جس نے اس کی نیند حرام کر دی تھی اور اس کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔

منصور کی سیاست

منصور کی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ اولاد علیؑ سے سخت تر سلوک کیا جائے۔ اسے ان کی اہلیت و صلاحیت کا مکمل علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ رسول اکرمؐ سے نسبی قرابت اور اپنے ذاتی خصوصیات کی بنا پر امت کی نظر میں خلافت کے لئے ان سے زیادہ سزاوار کوئی نہیں ہے۔

ابتدائی حالات میں بنی عباس نے اولاد علیؑ کا باقاعدہ ساتھ دیا۔ ان کی حمایت کے لئے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ بنی امیہ کو کھلم کھلا برا بھلا کہا اور امت پر برابر یہ ظاہر کرتے رہے کہ ہم حقوق آل محمدؐ کے محافظ اور ان کے حمایتی ہیں لیکن اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی بیعت کے ہاتھ خونریزی کے ہاتھ بن گئے۔ حمایت کرنے والے دل بغض و حسد کی آماجگاہ بن گئے۔ اور حکومت ہر اس موقع کا انتظار کرنے لگی جب آل محمدؐ کا چراغِ زندگانی خاموش کر دیا جائے یا انھیں مختلف مصائب و آلام کا شکار بنا دیا جائے۔

منصور نے بھی اپنے دورِ حکومت میں اسی سیرت کو اپنایا۔ اولاد علیؑ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ ایک جماعت کو ربذہ میں جمع کر کے اتنے کوڑے لگوائے کہ کوڑے خون سے رنگین ہو گئے۔ اس کے بعد بعد بدترین سواری پر بٹھا کر کوفہ کی طرف روانہ کر دیا جہاں انھیں ایسے قید خانہ میں رکھا گیا جس میں دن اور رات کا کوئی امتیاز نہ تھا اور ان پر ایسے سپاہی مسلط کر دیئے گئے جن کے لغت میں رحم دلی اور انسانیت کی سی لفظیں نہ تھیں۔ اس کے بعد یہ بھی حکم دے دیا کہ مُردوں کے جنازے نہ اٹھائے جائیں تاکہ زندہ قیدی لاشوں کی بدبو سے ہلاک ہو جائیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ منصور نے ابراہیم بن عبداللہ کو قتل کرا کے ان کا سر ربیع کے ہاتھوں ان کے باپ کے پاس قید خانہ میں بھیج دیا۔ عبداللہ اس وقت نماز میں مشغول تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے ادریس نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا آواز دی۔ بابا نماز جلدی ختم کیجئے۔ عبداللہ نے نماز تمام کی اور بیٹے کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

فرمایا "مرحبا میرے لال! تو قرآن کی زبان میں ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے خدائی

عہد کو پورا کیا، پیمان شکنی نہیں کی اور جہاں جہاں پروردگار عالم نے وصل کا حکم دیا تھا وہاں وصل سے کام لیا۔

ربیع نے پوچھا کہ ابوالقاسم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؛

عبداللہ نے فرمایا بقول شاعر وہ ایک جوان تھا جو تلوار کے ذریعہ ذلت سے بچتا تھا اور گناہوں سے پرہیز کرتا تھا۔

اس کے بعد ربیع سے خطاب کر کے فرمایا کہ منصور سے یہ کہہ دینا کہ ہمارے دن تو پورے ہو رہے ہیں۔ اب تم سے قیامت ہی کے دن ملاقات ہوگی۔

آل محمدؐ اسی طرح قید خانہ کی مشقتیں برداشت کرتے رہے۔ تلاوتِ قرآن کی مقدار سے نماز کے اوقات کا اندازہ کرتے لیکن منصور سے یہ حالت بھی دیکھی نہ گئی۔ اس نے ایک دن قید خانہ کی عمارت کو ان کے سروں پر منہدم کرنے کا حکم دے دیا جس کے نتیجہ میں کچھ طوق وسلاسل میں جکڑے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے اور کچھ کے جسم میں دیوار کی کیلیں گڑ گئیں اور اس طرح منصور کی سیاست حد آخر تک پہنچ گئی ــــ (طبری، ابن اثیر، مروج الذہب)

خدا خدا کر کے ایک وقت وہ بھی آیا جب منصور نے بنی حسن کے ساتھ اپنے برتاؤ کی بدی کا احساس کیا اور اسے لوگوں کے دلوں میں ابھرتے ہوئے نفرت کے جذبات دکھائی دیئے۔ اس کی سیاست نے پلٹا کھایا اور اس نے ہاشمیہ میں ایک خطبہ پڑھا جس میں حمد وثنا کے بعد اس طرح خطاب کیا "اے اہل خراسان! تم میرے شیعہ اور میرے مددگار ہو۔ تم میرے علاوہ کسی دوسرے کی بیعت کرو گے تو وہ مجھ سے اچھا نہ ہوگا۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم میں نے اولادِ علیؑ کے ساتھ کوئی معمولی سی بدسلوکی بھی نہیں کی۔ بنی امیہ نے ہمارے اوپر حملہ کیا، ہماری شرافت کو مردہ بنانا چاہا۔ ہماری عزت کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ ہمارا ان سے کوئی سابقہ نہ تھا۔ ہم نے ساری مصیبتیں اولادِ علیؑ کی محبت میں برداشت کیں۔ دربدر کئے گئے۔ کبھی طائف گئے کبھی شام اور سراۃ کی طرف جلاوطن کئے گئے یہاں تک کہ خداوند عالم نے تم لوگوں کو میرا ساتھی بنا دیا اور اس طرح ہمارا شرف زندہ ہوا، ہمارا حق ظاہر ہوا اور ہماری میراث ہم تک پہنچ گئی۔ اللہ نے اپنے منارہ ہدایت کو بلند کیا اور اپنے انصار کو عزت بخشی۔ ظالموں کا سلسلہ ختم ہوا۔ والحمدللہ رب

العالمین۔ اب جب کہ ہمارے امور طے ہو چکے ہیں اور اللہ کا ملولانہ فیصلہ ہو چکا ہے تو یہ لوگ ہم سے حسد کرنے لگے ہیں۔ ہمارے اوپر ظلم کرتے ہیں اور ہمارے حقوق پر غاصبانہ حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ (مروج الذہب ۳ ص۳۲۷)

منصور نے اس خطبہ میں جس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو ایسے نرم لہجہ سے راضی کرے اور ان کے اندر نفرت کے جذبات نہ ابھرنے پائیں۔ ورنہ اسے خود بھی یہ معلوم تھا کہ اولاد علیؑ نے کسی وقت بھی حکومت کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا اور نہ انھیں سلطنت کی کوئی خواہش تھی۔ ان کے اقدامات کا محرک صرف یہ جذبہ تھا کہ ہم ظلم کے سامنے سر نہ جھکائیں گے۔ جیسا کہ ابن ساعی کا بیان ہے کہ "تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اہلبیتؑ کا کوئی اقدام ذلت واہانت کے ردعمل کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ بنی امیہ نے غلاموں پر احسانات، عربوں کو لاکھوں درہم ودینار کی داد ودہش، زمینوں اور جائدادوں کی تقسیم، عہدوں پر ان کی تقرری کے ساتھ بنی فاطمہؑ پر مصائب وآلام کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اپنے فسق وفجور کے ساتھیوں کو پوری سہولت دے رکھی تھی۔ بنی فاطمہؑ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان کی غیرت وحمیت اور ان کی شرافت وعزت انھیں ابھارتی تھی اور وہ قانون شکنی کے عنوان سے نہیں بلکہ یہ سوچ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ ارض خدا تنگ نہیں ہے۔ ہم ایسی جگہوں پر زندگی گذار سکتے ہیں جہاں ہمارے جد کی امت آباد ہو اور بنی امیہ کے مظالم سے راحت مل سکے۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے، ان کے جذبہ کو استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ بنی امیہ کو یہ خبر ناگوار گذرتی تھی۔ وہ ان کے پیچھے سپاہیوں اور فوجیوں کو لگا دیتے تھے تاکہ انھیں درجۂ شہادت پر فائز کر دیں۔ یہی حال بنی عباس کے دور حکومت بھی رہا۔"

(تاریخ ابن الساعی ط۳۶)

اس منزل تک پہنچنے کے بعد اس امر کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ آل رسول کے ساتھ بنی عباس کا برتاؤ بنی امیہ سے بالکل مختلف رہا ہے۔ بنی امیہ اپنی دشمنی میں کسی پوشیدگی کے قائل نہ تھے۔ ان کی عداوت بالکل علانیہ تھی اور ظاہر ہے کہ واقعۂ کربلا، اسیری اہلبیتؑ اور سب وشتم

امیر المومنینؑ کے بعد پوشیدگی کا سوال ہی کیا رہ جاتا ہے۔

لیکن بنی عباس نے ابتدائے کار میں حمایت اہلبیتؑ کی آڑلی اور جب نظمِ حکومت منصور کے دور میں مستحکم ہوگیا تو سب سے پہلے انھیں حضرات کو نشانہ ستم بنایا۔ تہ تیغ ہونے والوں میں سرفہرست انھیں کا نام تھا اور قید خانہ کی طرف جانے والے قافلے کے میرِ کارواں یہی حضرات تھے۔ منصور کے مظالم کی فہرست تو بہت طولانی ہے لیکن اس سلسلے کا سب سے اہم واقعہ صندوق کا ہے جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ منصور نے اپنی زندگی میں ایک صندوق بنوا رکھا تھا جسے روزِ قیامت، روزِ حساب، روزِ جزا، روزِ فیصلہ کے لئے محفوظ کئے ہوئے تھا اور اپنے بیٹے مہدی کی بیوی ریطہ کو اس کی کنجی دے دی تھی کہ میرے مرنے کے بعد اس کنجی کو مہدی کے حوالے کردینا۔ ریطہ کا خیال تھا کہ اس صندوق میں بہترین قسم کے جواہرات اور قیمتی موتی ہوں گے۔ چنانچہ منصور کے مرنے کے بعد وہ مہدی کو لے کر صندوق کے پاس آئی۔ دونوں فرطِ مسرت سے جھوم رہے تھے اور دونوں کی نگاہوں میں سنہرے روپہلے جواہرات چمک رہے تھے لیکن جب ریطہ نے مہدی کو کنجی دی اور مہدی نے خزانے کو کھولا تو اس میں کچھ ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی لاشیں جن کے کانوں میں ان کے نسب نامے آویزاں تھے کچھ اور بوڑھوں کی میتیں جنھیں منصور کے مظالم نے اس دنیا میں نہ رہنے دیا تھا، نظر آئیں۔ مہدی یہ دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ جسم میں لرزہ پڑ گیا اور فوراً ایک گڑھا تیار کرا کے سب کو دفن کر دیا اور اس پر ایک دکان تیار کرادی۔

(طبری ۹ صفحہ ۳۰۲ حوادث ۱۵۸ھ طا)

ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے بعد منصور کے مظالم کے سلسلہ میں کسی اور بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ منصور کی مکاری نے اتنے مظالم کے بعد بھی برابر اس بات کی کوشش کی کہ ان مظالم کو کھوکھلے زہد و تقویٰ اور ریاکارانہ عبادت کے پردے میں چھپا دیا جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ منصور کے چند ہوا خواہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں یہ خبر لے کر آئے کہ منصور بہت سادہ سا لباس پہنتا ہے بلکہ اس میں پیوند بھی لگاتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی سلطنت میں رہ کر فقیری

میں مبتلا ہے۔ (کامل ابن اثیر ۶ ص۱۳ ط ۱)

ایک مرتبہ منصور نے اپنے کاتب محمد جمیل کو پندرہ تازیانے اس بات پر لگائے کہ اس نے کتان کے کپڑے پہن رکھے تھے اور کہا کہ یہ اسراف ہے۔ گویا لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ بادشاہ اپنے معاملات میں بھی اس قدر احتیاط اور میانہ روی سے کام لیتا ہے۔

ایک مرتبہ روز عرفہ کے خطبہ میں بیان کیا "ایہا الناس میں زمین پر اللہ کی طرف سے بادشاہ ہوں۔ اس کی توفیق و تائید سے حکومت کرتا ہوں۔ اللہ کے مال کا خزانہ دار ہوں۔ اس کی مشیت کے مطابق خرچ کرتا ہوں۔ اس کی اجازت سے داد و دہش کرتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے خزانوں کا قفل بنا دیا ہے۔ جب تمھیں کچھ دینا چاہتا ہے تو میرا منہ کھل جاتا ہے اور جب نہیں چاہتا تو قفل بند ہی رہتا ہے لہذا آج کے دن اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلاؤ اور اس سے سوال کرو۔ (طبری ۶ ص۳۳۰)

مقصد یہ تھا کہ لوگ میرے بخل یا میری زیادتی پر نظر نہ رکھیں بلکہ ان تمام باتوں کا ذمہ دار اپنے خالق و مالک کو قرار دیں۔ وہ چاہتا تو میں ضرور دیتا۔ میں نہیں دیتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہی تمام لوگوں پر مہربان نہیں ہے۔

اس کے بعد تقدس کے بلند ترین زینہ پر قدم رکھتے ہوئے اعلان کرتا ہے "خدائے برتر کا شکر ہے۔ اسی سے مدد، اسی پر ایمان اور اسی پر اعتماد ہے۔ میں اس کی توحید کی شہادت دیتا ہوں" یہ سننا تھا کہ ایک شخص پہلو سے بول اٹھا "اسی خدا کو یاد کیجئے" منصور نے اس کلام پر خطبہ کو روک دیا اور کہنے لگا کہ میں خدائے برتر کی اطاعت کرتا ہوں اور اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھے جبار و ظالم کہا جائے۔

اس کے بعد قوم سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ خبردار تم میں سے کوئی ایسی بات نہ کرے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ حکمت ہم پر نازل ہوئی ہے۔ ہمیں اس کے اہل ہیں۔ اس کا ورود و صدور ہماری ہی منزلوں سے ہے۔

منصور ان تمام باتوں سے اپنے تقدس کا رعب جما کر عوام کی زبان بندی کرنا چاہتا تھا اور انھیں یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ میں صرف خدا کے حکم سے کام کرتا ہوں۔ میرا کوئی عمل اس کی مرضی

سے جدا نہیں ہے۔ بداعمالیاں بنی امیہ کا حصہ تھیں ان کے ساتھ ختم ہوگئیں ـــــ حالانکہ منصور کا دور بنی امیہ ہی کے دور حکومت کا ایک تسلسل تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے عبدالرحمٰن افریقی سے کہا کہ میری سلطنت اور بنی امیہ کی سلطنت میں کیا فرق ہے؟ عبدالرحمٰن نے برجستہ جواب دیا کہ بنی امیہ کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو آپ کی سلطنت میں نہ دیکھ لیا گیا ہو۔

عبدالرحمٰن ابتدا میں منصور کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اور اسی بچپنے کی دوستی کی بنا پر منصور کے پاس آیا تھا۔ پہلے تو اسے ایک مہینہ تک باریابی کا شرف ہی نہیں مل سکا۔ اس کے بعد جب اجازت ملی تو منصور نے دیکھتے ہی یہ سوال کیا کہ کیسے آنا ہوا؟ عبدالرحمٰن نے فوراً جواب دیا کہ ہمارے شہروں میں ظلم وجور عام ہوگیا ہے۔ میں اس بات کی طرف متوجہ کرنے آیا ہوں کہ آپ کی حکومت میں ایسے حالات قطعی غیر مناسب ہیں۔ منصور کو یہ سن کر غصہ آگیا اور اس نے عبدالرحمٰن کو باہر نکلوا دیا۔ (تاریخ الخلفا سیوطی ص۱۰۵)

اپنی زندگی کے آخری سال منصور حج کے لئے گیا تو خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے ایک آواز سنی: "خدایا میں روئے زمین پر فساد اور ظلم کے پھیل جانے کی شکایت کرتا ہوں۔ اہلِ طمع نے حق سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔"

منصور یہ سن کر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا اور اس نے دعا کرنے والے کو طلب کرکے اس سے دعا کا مفہوم پوچھا۔ اس نے امان طلب کی اور اس کے بعد کہا کہ جس کے طمع کی بنا پر اہلِ حق کو ان کے حق سے محروم کیا ہے، وہ تیری ذات ہے۔

منصور نے کہا خدا تیرا برا کرے، میرے پاس خزانے موجود ہیں۔ مجھے طمع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نے کہا امیر! پروردگار نے آپ کو مسلمان اور ان کے اموال کا امین بنایا تھا آپ نے ان اموال پر پہلے اینٹ پتھر کے دربان بٹھائے پھر لوہے کے دربان بنائے پھر مسلح آدمیوں کو مقرر کرکے یہ حکم دے دیا کہ سوائے چند افراد کے کوئی دوسرا نہ آسکے۔ تیرے یہاں مظلوم، ستم رسیدہ، کمزور، فقیر اور بھوکے ننگے لوگوں کی رسائی کا کوئی ذکر نہیں ہے حالاں کہ اس مال میں ان کا بھی حق ہے۔ دوسری طرف تیرے مخصوص افراد نے جب یہ دیکھ لیا کہ تو ان

میں ڈھال دے چنانچہ تبلیغ کرنے والے علماء باہر نکال دیئے گئے اور خوشامدی علماء مقرب بارگاہ بنتے رہے۔ اولادِ رسولؐ کا خون بہایا جایا جارہا تھا۔ قید خانے آباد ہو رہے تھے اور اسی کے ساتھ ایک پرانے بوریا کو محفوظ کر کے اس پر ایک سپاہی معین کردیا تھا جس کو شہرت یہ دی گئی تھی کہ یہ رسول اکرمؐ کی چٹائی ہے۔ پھر اسے نماز کے وقت عوام کو دکھلا کر یہ نمائش کی جاتی تھی کہ ہم آثارِ رسولؐ کے محافظ ہیں۔

دوسری طرف زاہدوں اور واعظوں کو مدعو کر کے ان سے وعظ و نصیحت کرنے کی فرمائش کی جاتی تھی اور ان کے وعظ پر مصنوعی آنسو بہائے جاتے تھے تاکہ لوگ رقت اور پاک باطنی سے مرعوب ہوسکیں یہ مثل مشہور ہے "ایک ہاتھ سے ذبح کرے اور ایک ہاتھ سے تسبیح پڑھے"۔

یہ سلسلہ بنی عباس میں بہت بعد تک جاری رہا اور ہر دور میں رسول اکرمؐ کے نام سے بشارتیں گڑھی جاتی رہیں تاکہ اپنی سلطنت کو دینی رنگ دیا جاسکے۔ چنانچہ ایک روایت یہ تیار کی گئی "خدا عباس، ان کی اولاد اور ان کے چاہنے والوں کو بخش دے"۔

(تاریخ بغداد ۱۰؍۳۹)

دوسری روایت یوں وضع ہوئی "خدایا عباس، ان کی اولاد اور ان کے چاہنے والوں کو بخش دے۔ خدایا عباس کے ظاہر و باطن تمام گناہوں کو بخش دے اور ان کی ذرّیت کے قیامت تک کے گناہ معاف کردے"۔ (شرح ہمزیہ ابن حجر ص۳۱۸)

ایک روایت سفاح کی شان میں تیار کی گئی "فتنوں کے ظہور کے وقت اور کافی زمانہ کے بعد ہم سے ایک شخص ظاہر ہوگا جس کا نام سفاح ہوگا" اس روایت کو ابو سعید خدری کی طرف منسوب کیا گیا اور ایک مہدی بن منصور کے نام سے بنی "ہم سے سفاح، منصور اور مہدی پیدا ہوں گے"۔ (تاریخ بغداد ۱۰؍۴۸)

ڈاکٹر احمد امین کا بیان ہے کہ عباس اور اولادِ عباس کے بارے میں متعدد روایتیں گڑھی گئیں۔ جن میں ایک روایت تھی کہ ایک مرتبہ عمر بن خطاب نے قحط کے زمانہ میں عباس سے تقاضا کیا۔ انھوں نے دعا کی اور فوراً بارش ہوگئی۔ جس پر انھوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم خدا تک پہنچنے کا وسیلہ بنی عباس ہیں۔ بلکہ لوگوں نے بھی انھیں ساقی الحرمین کے لقب سے یاد کرنا شروع

کر دیا۔ (اسد الغابہ ۳ ص۱۱۱)

اور بعض راویوں نے یہ روایت وضع کی کہ ابن عباس اپنے وقت کے وہ عظیم سیاسی انسان تھے جن سے حضرت علیؑ استفادہ کیا کرتے تھے، حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ ابن عباس صرف صاحبِ علم تھے۔ انھیں سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ (ضحی الاسلام)

علمارِ رجال و حدیث نے ان روایتوں کی بے اعتباری کو واضح کر دیا ہے اور بنی عباس کے اس ڈھونگ کو طشت از بام کر کے امّت کو متنبہ کر دیا ہے کہ ان کے دورِ حکومت کو اسلام کی حکومت اور بانیِ اسلام کی خلافت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ منصور نے امام صادقؑ کو اذیت دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت اس کے شر سے برابر بچتے رہے اور آپ پر کوئی اثر نہیں ہو سکا۔

آپ کی سیاست کا ماحصل یہ تھا کہ لوگوں کی اصلاح کی جائے۔ انھیں حکومت سے قطع تعلق پر آمادہ کیا جائے اور حکومت کو بتا دیا جائے کہ یہ عوام ان مظالم پر صبر کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حالات زمانہ اور مصلحتِ اسلام کھلی ہوئی جنگ کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔

یہ تذکرہ ان مصائب و آلام کا ہے جو خود امام علیہ السّلام کی ذات سے متعلق تھے اور ظاہر ہے کہ جو حکومت امام کو اس جلالت و ہیبت کے باوجود نہیں معاف کر سکتی تھی وہ ان کے چاہنے والوں اور شیعوں سے کس طرح چشم پوشی کر سکتی تھی جب کہ شیعہ ان کے انصار و اعوان اور ان کے گھرانے والوں کا مشہور لقب تھا۔

اب کیا تھا، مصائب کا رخ ان کی طرف بھی موڑ دیا گیا۔ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ قید خانے آباد ہونے لگے اور ایسے ایسے حالات سامنے آنے لگے جن کی تفصیل بیان کرنے سے قلم لرزتا ہے۔ لیکن کیا کہنا ان جواں ہمت چاہنے والوں کا انھوں نے کبھی ان مظالم کی پرواہ نہیں کی۔ ظلم کا مقابلہ عزم و استقلال سے کرتے رہے۔ حکومت کا رعب و داب یا اس کی داد و دہش ان کے دلوں کو آلِ محمدؐ کی طرف سے منحرف نہ کر سکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ لفظ شیعہ جہاں عمومی نفرت و عداوت کا سبب بن گیا وہاں حکومتیں اس نام سے لرزنے بھی لگیں۔ حکومتوں کے پاس عقیدہ کی

اس آہنی دیوار کو توڑنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس نے "علماء سوء" کا سہارا لیا اور ان لوگوں نے بھی دل کھول کر فتوے دیئے۔ اور عوام کو یہ باور کرا دیا کہ شیعوں کی طرف سے حق آل محمدؐ کی حمایت۔ ان کی اہلیت وصلاحیت یا رسول اکرمؐ سے ان کی قرابت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کا راز صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اہلبیتؑ کو اپنا خدا سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ کافر ہیں۔ ان کے لئے ہر اذیت و آزار جائز اور معشیت و آزادئ فکر و اظہار عقائد و اقامہ شعائر جیسی تمام آزادیاں حرام ہیں۔

زمانہ یہ ہے کہ ایک کافر خدا کا انکار کر کے فراغت کے ساتھ زندگی گذار رہا ہے لیکن ایک شیعۂ آلِ محمدؐ چاروں طرف سے حملوں کا نشانہ بنا ہوا ہے جب کہ وہ توحید خدا اور رسالتِ رسولؐ کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ حکومت کی خواہشات کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہتا ہے اور اسی بنا پر اس کی حدیث لینا حرام بلکہ باعثِ عقوبت اور سبب بے دینی ہے اور اس کا اپنا خون تو بہر حال حلال ہے۔

یہ اس دور کا ایک اجمالی خاکہ ہے جب شیعیانِ آلِ محمدؐ حکومت کی نظروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ان کی تباہی و بربادی کے وسائل کا تلاش کرنا حکومت کا منصبی فرض بن گیا تھا۔ ان کے خلاف تہمتیں گڑھی جا رہی تھیں اور ان کی طرف سے رائے عامہ کے منحرف کرنے میں کسی سچ جھوٹ سے پرہیز نہیں کیا جاتا تھا۔ ان واقعات کے نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ دور حاضر کے تنقیدی ذہن اسلامی تاریخ کے میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔ جہاں تہمتوں کا جال پھیلا ہوا ہے الزامات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ دامن تحقیق کسی مقام پر الجھ جائے اور سالک حقیقت تلاش منزل میں ناکامیاب ثابت ہو۔

اس کے بعد ہم ائمہ اربعہ کے دوسرے امام مالک کی زندگی کی طرف متوجہ ہوں گے اور اسی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھائیں گے کہ صرف تاریخی حقائق سے بحث کی جائے۔ نہ کسی حمایت کا پہلو ہو اور نہ عداوت و عصبیت کا۔

چہل حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام

۱۔ جو شخص سلام سے پہلے بات کرنا شروع کر دے اس کو جواب نہ دو۔ [۱]

۲۔ شخصی زندگی اور اجتماعی معاشرت کی اصلاح ایک ایسا بھرا ہوا پیمانہ ہے جس کا دو تہائی حصہ، ہوشیاری ہے اور ایک تہائی حصہ، چشم پوشی ہے۔ [۲]

۳۔ جب تمہارے دنیاوی امور ٹھیک ٹھاک ہو جائیں تو اپنے دین کو مہتم کرو۔ [۳]

۴۔ مالک و سردار لوگوں کی طرح تم لوگوں کے عیوب کو نہ دیکھو اور بندہ و غلام کی طرح اپنے عیوب کو دیکھتے رہو۔ [۴]

۵۔ جس کے اندر یہ تین (۳) صفتیں موجود ہوں وہ منافق ہے چاہے وہ روزہ رکھے اور نماز بھی پڑھے وہ یہ ہیں: (۱) کچھ کہے تو جھوٹ بولے۔ (۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ (۳) جب اس پر اعتماد کیا جائے تو امانت میں خیانت کرے۔ [۵]

۶۔ اگر کسی کا دل کسی کو چاہتا ہو تو اس کو پھیرنے سے زیادہ آسان پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹانا ہے۔ [۶]

۷۔ خبردار! ایک دوسرے پر حسد نہ کرنا کیونکہ کفر کی جڑ حسد ہے۔ [۷]

۸۔ چار چیزیں کم ہونے کے باوجود بھی زیادہ ہیں: (۱) آگ، (۲) دشمنی، (۳) فقر، (۴) بیماری۔ [۸]

۹۔ جو دوسروں کے عیوب سے پردہ اٹھائے گا اس کے گھر کے اسرار و عیوب ظاہر ہو جائیں گے۔ [۹]

---

[۱] تحف العقول: ص ۲۴۵
[۲] تحف العقول: ص ۳۷۶
[۳] تحف العقول: ص ۳۷۷
[۴] تحف العقول: ص ۲۹۵
[۵] تحف العقول: ص ۲۲۹
[۶] تحف العقول: ص ۲۴۰
[۷] اعیان الشیعہ: ۱/ ۶۷۳
[۸] اعیان الشیعہ: ۱/ ۶۷۴
[۹] اعیان الشیعہ: ۱/ ۶۷۴

۱۰۔اپنے بھائیوں کو دو(۲) خصلتوں سے آزماؤ اگر ان کے اندر یہ صفتیں ہوں تو ان سے دوستی برقرار رکھو ورنہ دوری اختیار کرو!(۱) اوقات نماز کی پابندی۔(۲) تنگدستی و آسائش میں بھائیوں کے ساتھ نیکی۔[1]

۱۱۔اے جندب کے بیٹے! ہر وہ مسلمان جو ہماری معرفت رکھتا ہے اس پر یہ حق ہے کہ روزانہ اپنے اعمال کو خود چیک کرے، اپنا حساب کرے پس اگر نیکی دیکھے تو مزید اضافہ کرے اور اگر گناہ دیکھتے تو توبہ کرے تاکہ قیامت کے دن ذلیل نہ ہو۔[2]

۱۲۔جب خدا کو کسی کی نیت کی سچائی کا علم ہو جاتا ہے تو صرف اسی نیت ہی پر اس کے لئے وہ ثواب لکھ لیتا ہے جو انجام دینے کے بعد لکھتا ہے یقیناً خدا کریم و مہربان ہے۔[3]

۱۳۔جہنمیوں کو اس وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رکھا جائے گا کہ دنیا میں ان کی نیت یہ تھی: اگر وہ ہمیشہ دنیا میں رہیں گے تو اسی طرح خدا کی نافرمانی کرتے رہیں گے۔ اہل جنت کو اس وجہ سے ہمیشہ جنت میں رکھا جائے گا کہ دنیا میں ان کی نیت یہ تھی: اگر وہ دنیا میں باقی رہیں گے تو اسی طرح ہمیشہ خدا کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ پس دونوں کو ان کی نیتوں کی وجہ سے جنت یا جہنم میں ہمیشہ رکھا جائے گا۔

۱۴۔توریت میں لکھا ہے: ہم نے تمہارے لئے نوحہ کیا لیکن تم نہ روئے۔ تمہاری تشویق کی مگر تمہیں کوئی شوق پیدا نہ ہوا۔ قاتلوں کو یہ بتا دو کہ خدا کی ایک ایسی تلوار ہے جو چین سے نہیں رہتی اور وہ "جہنم" ہے۔ اے چالیس (۴۰) سال والو! حساب کے لئے آمادہ رہو! اے پچاس (۵۰) سال والو! تم لوگ اس کھیت کے مانند ہو جس کے کاٹنے کا وقت قریب ہو گیا ہے۔ اے ساٹھ (۶۰) سال والو! تم لوگوں نے کون سی چیز پہلے بھیجی اور کون سی چیز پیچھے چھوڑی؟ اے ستر (۷۰) سال والو! اپنے کو مردوں میں شمار کرو! اے اسّی (۸۰) سال والو! تمہاری صرف نیکیاں لکھی جا رہی ہیں، گناہ نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ اے نوے (۹۰) سال والو! تم روئے زمین پر خدا کے اسیر ہو.......... تم کیا سوچتے ہو کہ خدا اپنے اسیر کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا؟[4]

۱۵۔آگاہ ہو جاؤ! اندھیرے میں مسجدوں کی طرف جانے والوں کو یہ بشارت و خوشخبری دے دو کہ قیا

---

[1] اعیان الشیعۃ: ۸/ ۵۰۳

[2] تحف العقول: ص ۳۱۱

[3] اصول کافی: ۲/ ۱۳۵

[4] موسوعۃ الامام الصادق: ۱۱/ ۱۷ [باب ۴؛ بحار: ۶/ ۱۳۶] بحوالہ روضۃ الواعظین: ص ۴۹۰

مت کے دن ان کے اندر نورانیت ہوگی۔ [۱]

۱۶۔ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں مالداروں کی برائی بیان کی تو امام علیہ السلام نے فرمایا: خاموش ہو جاؤ! کیونکہ جب مالدار انسان صلۂ رحم انجام دیتا رہتا ہے اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیکی انجام دیتا رہتا ہے تو خدا اسے دوگنا اجر و ثواب دیتا ہے کیونکہ وہ ارشاد فرماتا ہے: "تمہارے اموال اور اولاد میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہیں ہماری بارگاہ میں قریب بنا سکے علاوہ ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے تو ان کے لئے ان کے اعمال کا دہرا بدلہ دیا جائے گا اور وہ جھروکوں میں امن و امان کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔" [۲]

۱۷۔مجھ کو بالکل پسند نہیں کہ تمہارے کسی جوان کو دیکھوں مگر یہ کہ وہ ان دو (۲) حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہو: یا عالم ہو یا طالب علم۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس نے کوتاہی کی اور اگر تفریط و کوتاہی کی تو تباہ و برباد کیا جب برباد کیا تو گناہ کیا اور جب گناہ کیا تو اس خدا کی قسم! جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برحق مبعوث کیا وہ جہنم میں رہے گا۔ [۳]

۱۸۔ جو شخص ناحق، ریاست طلب کرے گا وہ کمزور لوگوں کی برحق اطاعت سے محروم رہے گا۔ جو ناحق، مال کو طلب کرے گا وہ مال کے برحق باقی رہنے سے محروم رہے گا۔ [۴]

۱۹۔جو شخص تین (۳) ناحق چیزوں کی تمنا کرے گا وہ تین (۳) برحق چیزوں سے محروم رہے گا: جو ناحق، دنیا کو طلب کرے گا وہ برحق آخرت سے محروم رہے گا۔ [۵]

۲۰۔جس چیز کے بارے میں انسان کا ارادہ، قوی (و پختہ) ہوتا ہے اس کے انجام دینے میں بدن، ناتواں نہیں ہوتا ہے۔ [۶]

۲۱۔جب سے خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے اسی وقت سے اس کے اولیاء، مستضعف

---

[۱] ثواب الاعمال: ص ۴۵، ح ۱۲

[۲] علل الشرائع: ص ۶۰۴۔ ۷۳

[۳] امالی طوسیؒ: ص ۳۰۳۔ ۶۰۴

[۴] تحف العقول: ص ۳۲۵

[۵] تحف العقول: ص ۳۲۵

[۶] وسائل الشیعہ: جلد اوّل، باب استحباب نیۃ الخیر

اور کم رہے ہیں۔ [۱]

۲۲۔ خداوند عالم نے دنیا میں اپنے ولی ودوست کو اپنے دشمن کا مقصد ومنشا قرار دیا ہے۔ [۲]

۲۳۔ سخاوت اور خوش اخلاقی اختیار کرو کیونکہ جس طرح ہار کا درمیانی بڑا موتی اس کی زینت ہے اسی طرح یہ دونوں بھی مرد کی زینت ہیں۔ [۳]

۲۴۔ اپنے دین کے بارے میں ڈرواسے تقیہ کے ذریعہ پوشیدہ رکھو کیونکہ جو تقیہ نہیں کرتا وہ ایمان نہیں رکھتا۔ [۴]

۲۵۔ جو لوگوں کے کسی امر کی ذمہ داری سنبھالتا ہے پھر عدالت کرتا ہے، لوگوں کے لئے اپنا دروازہ کھولے رکھتا ہے، اپنے شر کو دور رکھتا ہے، لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے تو خدا پر یہ حق بن جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسے خوف وہراس سے محفوظ رکھے اور جنت میں داخل کردے۔ [۵]

۲۶۔ اے ابوبصیر! کیونکہ اگر روح، بدن سے الگ ہو جائے گی تو بدن میں واپس نہیں آئے گی ہاں! روح بالکل سورج کی طرح جگر کے اندر موجود ہوتی ہے جیسے سورج فلک میں ہوتا ہے اور اس کی روشنی پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ [۶]

۲۷۔ بیشک ہم اہل بیت (علیہم السلام) کی جوانمردی یہ ہے کہ جو ہم پر ظلم کرتا ہے ہم اسے بخش دیتے ہیں۔ [۷]

۲۸۔ جب آبروریزی ہو جائے تو اس کا جبران بہت دشوار ہے۔ [۸]

۲۹۔ خبردار اپنی مشکلوں کو لوگوں سے بیان نہ کرنا ورنہ تمہاری عزت گھٹ جائے گی۔ [۹]

---

[۱] بحارالانوار: ۶۸/ ۱۵۴

[۲] بحارالانوار: ۶۸/ ۲۲۱

[۳] میزان الحکمۃ: ص ۲۳۰۰، ح ۸۰۱۰، بحوالہ بحار: ۷۱/ ۳۹۱

[۴] میزان الحکمۃ: ج ۱۴، ح ۲۲۴۹۴، ص ۷۰۴۶، بحوالہ الکافی: ۲/ ۲۸۱

[۵] میزان الحکمۃ: ح ۲۷۷۴۳، ص ۲۱۲۲، بحوالہ بحار: ۷۵/ ۳۴۰

[۶] میزان الحکمۃ: ص ۲۱۵۸، ح ۷۵۰۵، بحوالہ بحار: ۶۱/ ۴۳، ح ۱۹

[۷] میزان الحکمۃ: ص ۴۸۳۴، بحوالہ امالی صدوق: ۲۳۸، ح ۷

[۸] میزان الحکمۃ: ص ۳۵۵۰، ح ۱۲۱۵۴، بحوالہ اعلام الدین: ص ۳۰۳

[۹] میزان الحکمۃ: ح ۸۰۹۸، ص ۲۳۳۳، بحوالہ الکافی: ۴/ ۲۱، ح ۷

۳۰۔ جو شخص کسی مومن کے خلاف کوئی ایسی بات نقل کرے جس سے اس کی برائی کا ارادہ کرے اور اس کی عزت و آبرو کو ختم کرنا چاہے تا کہ لوگوں کی نظروں میں گر جائے خداوند عالم اس کو اپنی دوستی سے نکال کر شیطان کی دوستی میں لگا دیتا ہے۔[1]

۳۱۔ جب تک مومن بندہ خاموش رہتا ہے وہ نیکوکار لکھا جاتا ہے جب بولتا ہے تو (بولنے کے مطابق جیسا بھی اچھا برا بولے) نیکوکار یا بدکار لکھا جاتا ہے۔[2]

۳۲۔ گھر والوں کو ان باتوں کا حکم دو جن کا خدا نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکو جن سے خدا نے روکا ہے اگر انہوں نے تمہاری اطاعت کی تو تم نے ان کو جہنم سے محفوظ رکھا۔ اگر وہ لوگ تمہاری نافرمانی کریں (تمہاری بات نہ مانیں) تو تم نے اپنی شرعی ذمہ داری پر عمل کر لیا۔[3]

۳۳۔ سجدہ، انسانی عبادت کی معراج ہے۔[4]

۳۴۔ جناب رسول خدا ﷺ ایک سفر میں اپنی سواری سے نیچے اترے پانچ (۵) مرتبہ سجدہ بجالائے جب سوار ہوئے تو ایک صحابی نے عرض کیا کہ ہم نے آپ سے ایک ایسا عمل دیکھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا!

فرمایا: ہاں! جبرئیل نے آ کر مجھے یہ بشارت دی کہ حضرت علی علیہ السلام جنت میں رہیں گے لہٰذا میں نے اس کے شکرانے کے طور پر سجدہ ادا کیا۔

جب سر اٹھایا تو انہوں نے دوبارہ کہا: حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی جنت میں رہیں گی، یہ سن کر میں نے دوبارہ سجدہ کیا۔

جب سر اٹھایا تو انہوں نے کہا: حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام جنت کے جوانوں کے سردار رہیں گے، میں پھر سجدہ شکر بجالایا۔

اب جو سر اٹھایا تو یہ بشارت دی: جو شخص ان حضرات سے محبت کرے گا وہ بھی جنت میں رہے گا، میں نے سن کر سجدہ شکر ادا کیا۔

---

[1] ثواب الاعمال: ص ۵۴۷

[2] ثواب الاعمال: ص ۳۶۴

[3] میزان الحکمۃ: ۳۰۴۷، ح ۱۰۷۱۲، بحوالہ تحف العقول: ص ۲۳۷

[4] میزان الحکمۃ: ۲۳۸۰، ح ۸۲۷۲

اب جو آخری مرتبہ سر اٹھایا تو جبرئیل نے پھر بشارت دی: جو شخص اہل بیت علیہم السلام کے دوستوں سے محبت کرے گا وہ بھی جنت میں رہے گا، یہ سن کر میں سجدۂ شکر بجالایا۔[1]

۳۵۔ تمہارے لئے دعا کرنا ضروری ہے کیونکہ دعا کی طرح کسی چیز کے ذریعہ بھی خدا کی بارگاہ میں تقرب حاصل نہیں کر سکتے اور کبھی کسی حاجت کو چھوٹی سمجھ کر اس کے لئے دعا ترک نہ کرو۔[2]

۳۶۔ جب کسی (مومن) بندہ کا گناہ بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی ایسا عمل صالح انجام نہیں پاتا جو گناہوں کا کفارہ بن سکے تو خدا اسے محزون و غمگین کر دیتا ہے تا کہ اس طرح سے اس کے گناہوں کو پاک کر دے۔[3]

۳۷۔ مومن سختی و آسائش دونوں حالتوں میں اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرتے ہیں، تنگدستی میں دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔[4]

۳۸۔ مزدور کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ان کی اجرت دے دو۔[5]

۳۹۔ لوگ احسان و نیکی کر کے اپنی طبیعی زندگی سے زیادہ زندگی پا جاتے ہیں اور اسی طرح گناہ کر کے اپنی طبیعی موت سے پہلے مر جاتے ہیں۔[6]

۴۰۔ تین (۳) افراد کو صرف تین (۳) اوقات میں پہچانا جا سکتا ہے: (۱)۔ بردبار کو غصہ کے وقت۔ (۲)۔ بہادر کو جنگ کے وقت۔ (۳)۔ بھائی (دوست) کو ضرورت کے وقت۔[7]

---

[1] امالی: شیخ مفید: مجلس سوم، ح ۲، ص ۳۲، ۳۳

[2] امالی: مفید: مجلس دوم، ح ۹، ۳۱

[3] امالی: مفید: مجلس سوم، ح ۷، ص ۳۶

[4] بحار الانوار: ۳۵۱/۶۷، ح ۵۴

[5] اصول کافی: ۲۸۹/۲، ح ۳

[6] بحار الانوار: ۱۴۰/۵، ح ۷

[7] تحف العقول: ص ۳۲۹